# فہرست


| | | | |
|---|---|---|---|
| اداریہ | ابتدا تیرے نام سے | صائمہ اسما | 6 |
| انوار ربانی | قرآن مجید میں بخشش مانگنے کا تذکرہ | رفعت اشتیاق (مرحومہ) | |
| قولِ نبیؐ | بچے کی تربیت | عظمیٰ پروین | |
| خاص مضمون | جو میری حفاظت کا بندوبست کرے | ثریا بتول علوی | |
| حالاتِ حاضرہ | بھارت میں صنفِ نازک جنسی تشدد کا شکار | شبانہ اختر | 20 |
| نوائے شوق | نعت | اسرار احمد سہارویؒ | 23 |
| | مدحتِ مصطفیٰؐ | غازی بھوپالی | 24 |
| | غزل | شہود ہاشمی | 24 |
| | غزل | روبینہ فرید | 25 |
| | ماؤں بہنوں بیٹیوں کے نام | مختار حسین شارق | 25 |
| حقیقت وافسانہ | آدھا گلاس<br>خواہش | قانتہ رابعہ<br>صبیحہ نبوت | 26<br>28 |
| | زندگی تیرے کئی روپ | فرحی نعیم | 31 |
| | گوشۂ عافیت کی کہانی | جہاں آرا مظفر | 36 |
| سلسلہ وار کہانی | شکست کے رتھ پر سوار | نصرت یوسف | 38 |
| نمایاں خواتین کا تذکرہ | ملکہ ارجمند بانو ممتاز محل | آسیہ راشد | 49 |
| نہاں خانۂ دل | آؤ ایک بنیں! | ڈاکٹر عزیزہ انجم | 52 |
| | ایک زکام سو علاج | قانتہ رابعہ | 54 |
| | دو خط | ذروہ احسن | 58 |
| | سرِ راہ | شمیم فاطمہ | 60 |
| ملاقات | محترمہ نجمہ یاسمین یوسف سے ایک ملاقات | آسیہ راشد | 62 |
| مطالعہ گاہ | میری لائبریری سے | غزالہ عزیز | 69 |
| پل صراط پر | گھر کیوں ٹوٹ رہے ہیں؟ | قمر پرویز | 72 |
| خفتگانِ خاک | زندگی ہے غم ہی غم | ڈاکٹر ممتاز عمر | 74 |
| حسن معاشرت | دلوں میں جگہ بنایئے | حمیرا خالد | 76 |
| محشرِ خیال | ڈاکٹر شگفتہ نقوی، فرحت طاہر | | 78 |
| بتول میگزین | ذکیہ فرحت، شازیہ مسلم، فوزیہ عباس، ام حبیب | | 80 |

# ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام!

کئی ماہ بعد کچھ دن ایسے گزرے کہ ہلاکتوں، سانحوں اور حادثوں میں کمی آئی۔ ڈرون حملے رکے رہے۔ بلوچستان اور کراچی سمیت ملک کے دیگر حصے کسی بڑے المیے کا نشانہ نہیں بنے۔ جشنِ بہاراں نے شہر سجا دیئے، رنگ بکھرا دیئے اور خوشبوئیں لہرا دیں۔ اس پر ابرو باراں نے خوب رنگ جمایا اور بہار کا سماں مکمل کر دیا۔ اللہ کرے کوئی موسم آئے یا جائے، بہاریں یونہی ڈیرے جمائے رہیں۔ ماحول میں، دلوں میں، ذہنوں میں فصلِ گل کو کبھی زوال نہ آئے۔ بہار...... جو ایک احساس بھی ہے اور ایک عزم بھی...... رویہ بھی ہے اور کیفیت بھی! بقول نجیبؔ احمد:

اڑان بھرنے کی جب دل میں آرزو اُبھرے
قفس میں بیٹھا ہوا بال و پر بناتا ہوں

رہِ حیات میں جب شب اترنے لگتی ہے
میں اک چراغ کی لَو رات بھر بناتا ہوں

تمام دشتِ رواں ہے مرے جلَو میں نجیبؔ
اک ایک ذرے کو میں ہمسفر بناتا ہوں

مذاکرات کے عمل سے قوم کی امیدیں بے جا نہیں ہیں کہ اس وقت تک یہی پائیدار امن کا واحد راستہ ہے۔ ہم اس خانہ جنگی کی کیفیت سے نکلیں گے تو عوام کے مسائل حل کرنے کی طرف کوئی پیش قدمی ہوگی۔ توانائی کا بحران، کرپشن، روپے کی قدر میں کمی، بیرونی قرضوں کا بوجھ، بے روزگاری، یہ ایسے سلگتے مسائل ہیں جو ہمارے معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں مگر دس ماہ مکمل ہونے کے باوجود ہنوز حکومت کی توجہ کے منتظر ہیں۔ تعلیم کا شعبہ انقلابی تبدیلیوں کا متقاضی ہے مگر سیاسی فائدوں اور بیرونی مفادات کے گرد گھومتی ہوئی تعلیمی پالیسیاں ملک میں تعلیمی انقلاب نہیں لا سکتیں۔

حسینہ واجد نے نیا گُل کھلایا ہے۔ اپنی شدید کینہ پروری کے بعد اب اپنی جہالت کو پہنچی ہوئی تنگ نظری کا بھی خاطر خواہ ثبوت

دے دیا ہے۔ کرکٹ میچ کے دوران دوسری ٹیموں کے جھنڈے لہرانے پر پابندی لگا کر اس نے بے حد چھوٹے ذہن کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ اقدام صرف پاکستان سے اس کی نفرت ہی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اس کی بھارت نوازی کا بھی کھلا ثبوت ہے، کیونکہ دوسری طرف بھارت نے بھی مقبوضہ کشمیر میں ایسی ہی ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے جہاں پاکستان کی جیت پر خوشی منانے والے طلبہ کو جیلوں میں بھر دیا گیا۔

کینہ پروری، تعصب، چھوٹے پن، تنگ دلی اور تنگ ذہنی کی یہ مثالیں ہمارے ہاں ان لوگوں کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہونی چاہئیں جو سیاسی حالات سے قطع نظر خطے میں امن کو فروغ دینے کی بات کرتے ہیں، اور اس سلسلے میں پیش رفت کی ساری ذمہ داری یک طرفہ طور پر پاکستان پر ڈال دیتے ہیں۔ یہ ''بغل میں چھری منہ میں رام رام'' والی بنیا ذہنیت قائداعظمؒ محمد علی جناح خوب سمجھتے تھے۔ دوقومی نظریہ ہمارے وجود کا جواز اور ہماری قومی شناخت کی بنیاد ہے۔ ثقافتی تبادلے، کھیلوں کا فروغ اور پبلک ڈپلومیسی اسی تناظر میں ہونی چاہیے۔ اندرا گاندھی نے جس دوقومی نظریے کو خلیج بنگال میں غرق کر دینے کا دعویٰ کیا تھا، حالیہ اقدامات اس بات کا ثبوت ہیں کہ خود اسی کے پیروکار اس نظریے کو آج تک زندہ رکھے ہوئے ہیں اور پاکستان کے قیام کا جواز آج 65 برس بعد بھی خود فراہم کر رہے ہیں۔

مصر میں جمہوریت پسندوں کی آزمائش بڑھتی جا رہی ہے۔ جنرل سیسی کی غاصب فوجی حکومت نے پانچ سو انتیس افراد کو پھانسی کی سزا سنا دی ہے۔ وکلا کو دفاع کا موقع دیے بغیر نامزد افراد کی عدم موجودگی میں محض دو عدالتی کارروائیوں کے بعد یہ سزا سنا دی گئی، اسے مہذب دورِ جدید کی سب سے بڑی اجتماعی سزائے موت قرار دیا جا رہا ہے جو اخوان المسلمون کے حامیوں کو فساد کے نتیجے میں ایک پولیس مین کی ہلاکت پر دی جائے گی۔ دنیا بھر کے پریس نے اس فیصلے کو غیر منطقی اور غیر اخلاقی قرار دیا ہے، ٹیلی گراف لکھتا ہے کہ ''منتخب وزیراعظم کو ہٹانے کے باوجود حالیہ مصری حکومت نے اپنے نام نہاد 'جمہوریت کی جانب سفر'' کے لئے امریکہ اور برطانیہ کی حمایت حاصل کر لی ہے۔'' عالمی مفاد پرستوں کی چالیں تو ایک طرف، مگر افسوس اس بات پر ہے کہ ان مفادات کو سہارا دینے میں خود مسلمان قوتیں موجود ہیں جو اسلام پسند جمہوری قوتوں کو اپنے اقتدار و اختیار کے لئے خطرہ سمجھتی ہیں۔ اگر ہم اندر سے اتنے کمزور نہ ہوتے تو کسی کو ہمارے معاملات اپنے ہاتھ میں لینے کا موقع نہ ملتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم امت کے اندر موجود منافقین اور باطل کے آلہ کار لوگوں سے نجات حاصل کر سکیں۔ آمین۔

دعا گو

صائمہ اسما

☆☆☆

# قرآن مجید میں اللہ سے بخشش مانگنے کا تذکرہ

پہلے پیغمبروں کا اپنے یا دوسرے کے لئے استغفار کرنا یا ان کی امت کا توبہ واستغفار کرنا یا اس امت کو توبہ واستغفار کا حکم ہونا، ان سب کا تذکرہ ہمیں قرآن مجید میں جا بجا ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرنے کا وصف اور ہنر ایک ایسا فن ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو سکھایا ہے خاص طور پر اپنے انبیاء کرامؑ کو۔ انبیائے کرام نے اپنے اپنے دور میں اپنی امت کو سکھایا۔ قرآن پاک اور احادیثِ مبارکہ میں استغفار کا بیان بہت سے مقامات پر ہمیں ملتا ہے۔ خود ہمارے نبیؐ کا معمول رہا ہے اور آپؐ کو اس کا حکم بھی ہوا، باوجودیکہ آپؐ پاک تھے مگر اس سے آپؐ کا مرتبہ بلند ہوا۔ اور امت کو بھی اس کی تعلیم دینا مقصد تھا۔ فرشتوں کا یہ شغل ہے۔ امت کے ہر طبقہ کو اپنے لیے اور اپنے سابقین کے لئے اس کا حکم ہے۔ اس کے ساتھ ہی وعدۂ مغفرت بھی ہے۔ آخرت کے نفع کے ساتھ ساتھ دنیوی فائدے بھی ہیں مثلاً بارش کا ہونا، ترقی خوشحالی، شان وشوکت میں اضافہ، مال اور اولاد میں برکت، غم سے نجات، گزشتہ نقصان کی تلافی ہو جانا۔

۱۔ حضرت آدم وحضرت حواؑ:

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۔

ترجمہ: دونوں نے کہا اے ہمارے پروردگار ہم نے ظلم کیا اپنی جانوں پر اور اگر تو نہ بخشے ہم کو اور ہم پر رحم نہ فرمائے گا تو ہم ضرور برباد ہو جائیں گے۔

۲۔ حضرت نوحؑ :

وَاِلَّا تَغْفِرْلِىْ وَتَرْحَمْنِىْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ

(پارہ:۱۲،س:ہود)

ترجمہ: اور اگر آپ نہ بخشیں مجھ کو اور نہ رحم فرمائیں مجھ پر تو میں ہو جاؤں گا گھاٹا پانے والوں میں۔

اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ يُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا۔

(پارہ:۲۹۔نوح)

ترجمہ:بخشش مانگو اپنے پرودگار سے بے شک وہ بڑا
بخشنے والا ہے۔بھیج دیں گے تم پر آسمان سے موسلا دھار
بارش اور مدد فرمائیں گے تمہاری مال اور بیٹیوں سے اور
بنادیں گے تمہارے لیے باغ اور تمہارے لیے نہریں
جاری فرمائیں گے۔

۳۔حضرت ہودؑ:

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ
السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا
تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ

(پارہ:۱۲ہود)

ترجمہ:اے میری قوم بخشش طلب کرو اپنے رب
سے پھر توبہ کرو اس کی جناب میں کہ وہ بھیج دے گا تم پر
خوب برسانے والا (بادل) اور تم کو زیادہ دے قوت
پر قوت اور نہ پھرے جاؤ گنہگار ہوکر۔

۴۔حضرت صالحؑ :

فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ (پ۱۲)

ترجمہ:پس بخشش مانگو اپنے پروردگار سے پھر توبہ کرو
اس کی طرف۔

۵۔حضرت ابراہیمؑ:

اَرِنَامَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ
الرَّحِيْم.

(س:بقرہ ع:۵)

ترجمہ:اے اللہ ہم کو بتایئے ہماری عبادت کے
طریقے اور ہم کو معاف فرمایئے۔بے شک آپ بڑے
معاف کرنے والے مہربان ہیں۔

رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَ لِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْ مِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ
الْحِسَابُ (پ:۱۳۔ابراہیم)

ترجمہ:اے ہمارے پروردگار مجھ کو بخش دیجیے
اور میرے ماں باپ کو اور سب مومنوں کو جس دن قائم ہو
حساب۔

۶۔حضرت اسماعیلؑ:

اَرِنَامَنَاسِكَنَا......الخ. (بقرہ۔ع:۵)

۷۔حضرت شعیبؑ:

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ (پارہ۱۲ہود)

ترجمہ:اور بخشش مانگو اپنے پروردگار سے پھر رجوع
کرو اس کی طرف۔

۸۔حضرت یوسفؑ کا استغفار بھائیوں کے لئے۔

یَغْفِرُ اللّٰہُ لَکُمْ وَ ھُوَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ (پارہ:۱۳
یوسف)

ترجمہ:اللہ تعالیٰ تم کو بخشیں گے اور وہ سب مہربانوں

سے زیادہ مہربان ہیں۔

۹۔حضرت یعقوبؑ سے ان کے بیٹوں کی درخواست کرنا اوران کا وعدہ فرمانا:

یٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِئِیْنَ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُلَكُمْ رَبِّیْ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ. (پارہ۱۳یوسف)

ترجمہ:اے ہمارے باپ بخشش مانگئے ہمارے گناہوں کی بے شک ہم ہی قصور وار تھے یعقوبؑ نے فرمایاعنقریب بخشش مانگوں گاتمہارے لیےاپنے پروردگار سے بے شک وہ بخشنے والےمہربان ہیں۔

۱۰۔زلیخاکوامرِ استغفار:

ترجمہ:اور(اے زلیخا)بخشش مانگ اپنے گناہ کی۔

۱۱۔حضرت موسیٰؑ :

رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ(پارہ:۲۰ قصص)

ترجمہ:اے میرے پروردگار! میں نے اپنے اوپرظلم کیاآپ مجھے بخشش دیجیے۔

رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَلِاَخِیْ وَاَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِكَ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْن. (پارہ:۹۔س:اعراف)

ترجمہ:اے میرے پروردگار معاف فرمایئے مجھے اور میرے بھائی کواور لے لیجیے ہم کواپنی رحمت میں اورآپ سب زیادہ رحم فرمانے والے ہیں۔

۱۲۔حضرت موسیٰؑ کی امت کااستغفار:

لَئِنْ لَّمْ یَرْحَمْنَا رَبُّنَاوَیَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ لْخٰسِرِیْنَ. (پارہ:۹۔اعراف)

ترجمہ:اگرنہ رحم فرمائے ہم پرہمارا پروردگاراور نہ بخشے ہم کوتو بے شک ہم خراب ہوں گے۔

۱۳۔حضرت داؤدؑ :

فاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّرَاكِعاً وَّاَنَاب. (پارہ:۲۳ ۔ص)

۱۴۔حضرت سلیمانؑ:

رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكاً(پارہ:۲۳۔ص)

ترجمہ:اے میرے پروردگاربخش دیجیے مجھ کواورعطا فرمایئے مجھ کوبادشاہی۔

۱۵۔بلقیس ملکہ سبا:

رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ(پارہ:۱۹۔نمل)

ترجمہ:اے میرے رب میں نے اپنا ہی نقصان کیا تھااوراب میں اسلام لائی۔

۱۶۔حضرت یونسؑ:

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ.

(پارہ:۷۔ انبیآء)

ترجمہ: نہیں کوئی معبود تیرے سوا تو پاک ہے بے شک میں ظلم کرنے والوں میں سے ہوں۔

۱۷۔حضرت عیسیٰؑ امت کے لیے:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ.

ترجمہ: اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر ان کو معاف فرمادے تو بے شک تُو زبردست حکمت والا ہے۔

۱۸۔باغ والوں کا معافی مانگنا:

سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیْنَ. (پارہ:۲۹۔القلم)

۱۹۔بہت سے پیغمبروں کی امت کا استغفار:

رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبنا وَاِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا.

(پارہ:۴۔آل عمران ع ۱۵)

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار بخش دیجیے ہمارے گناہ اور ہماری زیادتیاں ہمارے کاموں میں۔

۲۰۔ہمارے پیغمبر ﷺ کو حکم استغفار اور وعدۂ مغفرت:

وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ☆

(پارہ:۲۶۔مومنون)

ترجمہ: اور کہیے اے میرے پروردگار! بخش دیجیے اور رحم فرمائیے اور آپ سب سے بہتر رحم فرمانے والے ہیں۔

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِکَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ (پارہ:۲۶۔محمد)

ترجمہ: اور معافی چاہو اپنے گناہ کیلئے اور مومن مردوں اور عورتوں کیلئے۔

لِیَغْفِرَلَکَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَاتَاَ خَّرَ

(پارہ:۲۶۔فتح)

ترجمہ: تا کہ اللہ تعالیٰ بخش دے جو کچھ آگے ہو چکے ہیں تمہارے گناہ اور جو پیچھے رہے (مراد امت کے گناہ ہیں)

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْهُ (پارہ:۳۰۔نصر)

ترجمہ: پس پاکی بیان کیجیے اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اور بخشش مانگئے۔

(ماخوذ: فضائلِ استغفار مولانا اشرف علی تھانویؒ)

☆☆☆

عظمیٰ پروین

# بچے کی تربیت

بچے کی سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کی ایسی تربیت کی جائے کہ وہ سچا مسلمان اور خدا کا فرمانبردار بندہ بن جائے

ماں دورانِ حمل جو اعمال و افعال کرتی ہے اس کے اثرات پیدا ہونے والے بچے پر بہت زیادہ مرتب ہوتے ہیں۔ جو عورت حمل کے دوران اور دودھ پلانے کے زمانے میں جتنی نیک ہوگی اس کی اولاد بھی ایسی ہی نیک گناہوں سے بچنے والی اور دنیا میں دین کا پیغام بلند کرنے والی ہوگی۔ دوران حمل ماں کو اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کرنی چاہیے کہ یا اللہ ہماری اور ہمارے ہونے والے بچے کی شیطان سے حفاظت فرما۔

نومولود کے کان میں اذان اور اقامت کہی جاتی ہے تا کہ انسان کے کان میں سب سے پہلے اللہ سبحان وتعالیٰ کی عظمت و کبریائی کی آواز پڑے اور اس میں موجود قبولِ حق کی فطری صلاحیت مزید اجاگر ہوجائے۔

ارشادِ نبویؐ ہے: ''جب تمہاری اولاد بولنے لگے تو اسے لاالٰہ الا اللہ سکھا دو پھر مت پروا کرو کہ کب مرے اور جب دودھ کے دانت گر جائیں تو نماز کا حکم دو۔'' (نسائی) حدیث میں یہ بھی ہے کہ جب حضور اکرمؐ کے خاندان کے کسی بچے کی زبان کھل جاتی تو آپؐ اس کو سورہ الفرقان کی دوسری آیت سکھاتے جس میں توحید کی پوری تعلیم کو بڑی خوبی کے ساتھ سمیٹ دیا گیا ہے، ۵ سال کی عمر تک جس بچے کے دل میں حقائقِ دینیہ اتر جائیں وہ سینکڑوں نظریاتِ فاسدہ کے درمیان سے گزرتے ہوئے بھی بالآخر مسلم قوت سے مالا مال ہوکر ابھرے گا۔ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد ماں کی ذمہ داری بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے جو بچے کے ذہن کی سادہ تختی پر وہ نقوش ثبت کرسکتی ہے جن کو کوئی تعلیم و تربیت آسانی کے ساتھ نہیں مٹا سکتی۔

اولاد کی پیدائش کے بعد والدین کو اپنے طرزِ عمل کو درست کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ ماں کو اولاد کی تربیت کے ضمن میں بہت صبر و حکمت سے کام لینا چاہیے۔ ارشادِ نبویؐ ہے: ''اپنی اولاد کا اکرام کرو اور انہیں احسن ادب سے آراستہ کرو۔'' (ابن ماجہ) یعنی اولاد کو اللہ کا عطیہ سمجھ کر ان کی قدر کی جائے اور انہیں بوجھ نہ سمجھا جائے اور ان کی عمدہ تربیت کی جائے تا کہ وہ شائستگی اور اچھے اخلاق وسیرت کے حامل

ہوں۔ارشادنبویؐ ہے:''انسان اپنے بچے کو ادب سکھائے تو یہ بلاشبہ اس سے بہتر ہے کہ ایک صاع غلہ وغیرہ صدقہ کرے۔''(ترمذی) ایک صاع ساڑھے تین سیر کا ہوتا ہے۔

اخلاق وکردار سے مزّین کرنے کے ضمن میں سب سے سنہرا دور بچپن کا دور ہے۔ بچے کی حالت سفید کپڑے کی مانند ہے جس پر جو رنگ چڑھا دیا جائے چڑھ جاتا ہے۔ بچپن ہی میں بچے کے عادات واطوار تشکیل پاتے ہیں۔ بچے کو بہترین انسان اور باعمل مسلمان بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے کردار کی تعمیر پر بچپن ہی سے توجہ دی جائے۔ بچوں کے ذہنوں میں خشک اصولوں کا بوجھ ڈالنے کی بجائے دلچسپ انداز میں قصے کہانیوں اور اچھی اچھی مثالوں کے ذریعے اخلاقی نصیحتوں کا مفہوم سمجھایا جائے۔ بچے عموماً کہانیاں سننے کے شوقین ہوتے ہیں۔ اگر مائیں ان کے اس شوق سے فائدہ اٹھائیں تو بالکل ابتدائی عمر ہی میں بچے کے ذہن میں نیکی کے بیج بوئے جاسکتے ہیں۔

بچے کی تربیت کے سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ بچے کو اچھا بنانے کے لیے والدین کا خود اچھا بننا ضروری ہے۔ ورنہ ان کے سمجھانے بجھانے کا بہت کم اثر ہوگا اور عجب نہیں کہ بالکل ہی نہ ہو۔ بچے جب دیکھیں گے کہ والدین انہیں جن کاموں کا حکم دے رہے ہیں ان پر خود عمل نہیں کرتے تو وہ ان کی نصیحتوں پر عمل کرنے کو غیر ضروری شمار کریں گے۔

بچوں کے معاملات میں ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے کہ وہ تو ابھی بچہ ہے ان باتوں کیا سمجھے گا۔ بچہ کم سے کم عمر میں آنکھ اور کان کے ذریعے سے اچھی اور بری باتیں اخذ کرتا رہتا ہے اور ان کو اپنی طبیعت پر جماتا رہتا ہے۔ انسان فطرتاً نقال پیدا ہوا ہے جیسے اعمال وافعال اس کے سامنے کیے جائیں وہی اس کی عادات وطوار میں شامل ہوجاتے ہیں۔

بچے کی سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کی ایسی تربیت کی جائے کہ وہ سچا مسلمان اور خدا کا فرمانبردار بندہ بن جائے۔ تربیت کی پہلی سیڑھی نماز ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے'' اپنے بچوں کو نماز سکھاؤ جب وہ سات برس کے ہوجائیں اور دس سال کی عمر میں نماز نہ پڑھیں تو ان کی پٹائی کرو۔''(ترمذی) عام طور پر والدین یہ عذر کرتے ہیں کہ ہم تو بچوں کو نماز کے لئے کہتے ہیں لیکن بچے مانتے نہیں ہیں۔ حالانکہ اگر بچے سکول جانے سے انکار کردیں تو ان کو سمجھا بجھا کر، ڈانٹ

ڈپٹ کر یا سزا دے کر ہر ممکن طریقے سے سکول جانے پر مجبور کیا جاتا ہے لیکن نماز کے معاملے میں یہ ڈھیل اور بے جا نرمی صرف اس لیے ہے کہ والدین بے نمازیوں کے ہولناک انجام سے غافل ہیں۔ دوسرے یہ کہ والدین ابتدائی عمر میں تربیت سے غفلت برتتے ہیں اور جب بچوں کی عمر دس بارہ سال ہو جاتی ہے تو انہیں صحیح راہ پر لگانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

جب بچے کچھ بڑے ہو جائیں تو والدین انہیں قرآن وحدیث کی تعلیم دیں اور بری صحبت سے بچائیں۔ بچوں کی عمر واستعداد کا لحاظ کرتے ہوئے پاکیزہ رسائل اور تعمیری لٹریچر فراہم کیا جا سکتا ہے۔ بچوں کو خلافِ شریعت کاموں سے روکا جائے اور اپنے طرزِ عمل سے یہ بات بچوں پر واضح کر دی جائے کہ ان کی خلافِ شریعت کوئی حرکت قطعاً برداشت نہیں کی جائے گی۔

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ جب بچہ سونے کے قریب ہوتا ہے تو اس کا دماغ ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ اس وقت سنی گئی بات کو وہ فوراً تسلیم کر لیتا ہے اور اس کے تحت الشعور میں وہ بات بیٹھ جاتی ہے۔ لہٰذا جب بچے سونے لگیں تو ماں کو چاہیے کہ نہایت محبت وحکمت کے ساتھ دن بھر کی غلطیوں سے اجتناب کی تلقین کرے۔ انہیں کوئی سبق آموز واقعہ سنائے یا قرآن وحدیث میں سے کوئی ایک نصیحت ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرے۔

ماں کو چاہیے کہ بچے کے مزاج اور اس کی صلاحیتوں کا گہرائی سے مطالعہ کرکے اس کی خوبیاں اور خامیاں معلوم کرکے پھر حکمت ودانائی سے ایک ایک خوبی کو پروان چڑھائے اور ایک ایک خامی کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ تمام خوبیاں نہ بیک وقت پروان چڑھ سکتی ہیں اور نہ ہی تمام نقائص بیک وقت ختم ہو سکتے ہیں۔

بچے کو جھوٹ سے بچانے کا واحد راستہ یہی ہے کہ والدین خود ہمیشہ سچ بولیں اور کبھی مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولیں۔ ماں کو خیال رکھنا چاہیے کہ اس کا بچہ کسی کے لئے باعثِ تکلیف نہ بنے۔ بچہ اگر کسی دوسرے کی چیز لے آئے تو بچے کو پیار سے سمجھا دے کہ کسی کی چیز بلا اجازت لینا برائی کی بات ہے اور پھر وہ چیز اصل مالک تک پہنچا دے۔ ایک ڈاکو کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ اس کی ماں روتی ہوئی اس سے آخری بات کرنے کے لئے آگے بڑھی، ڈاکو نے دانتوں سے ماں

کے کان پر اتنی زور سے کاٹا کہ وہ چیخ اٹھی۔ لوگوں کے ملامت کرنے پر وہ بولا ''اسی ماں کی بدولت آج مجھے پھانسی پر چڑھایا جارہا ہے۔ جب میں بچہ تھا تو پڑوسی کے گھر سے ایک سیب چرالایا تھا۔ اس نے وہ سیب خوشی خوشی رکھ لیا۔ یہیں سے مجھے چوری کی عادت پڑی۔ اس وقت اگر مجھے ایسا کرنے سے روک دیتی تو میری پھانسی کا حکم نہ ہوتا۔''

اپنے بچوں کو احساس دلائیں کہ ہم لوگ خدا کے ساتھ وعدہ کر چکے ہیں کہ دنیا میں توحید اور نیکی پھیلائیں گے۔ اس مقصد کے لیے ہمیں وقت، سرمائے اور محبت کا ایثار کرنا ہوگا۔ اسی وجہ سے ہم بہت زیادہ کمائی نہیں کر سکتے۔ لیکن خادمانِ دین سے خدا نے بے حساب اجر کا وعدہ کیا ہے۔ باہر کا ماحول چونکہ قبضے میں نہیں ہوتا اس لیے بہت سی باتوں میں بچوں کو سمجھانا ہوگا کہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد خدا اور رسولؐ کی نافرمانی کے باعث گمراہ ہوگئی ہے لیکن تمہیں قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھل کر خدا کی رضا اور اس کی جنت کا طلبگار رہنا ہے۔ ماں بچے سے جنت اور اہلِ جنت کی خوبصورت باتیں کر کے بچپن ہی سے جنت کے حصول میں کوشاں رہنے کی آرزو جگا سکتی ہے۔

خدا کے بعد بچے کی جائے پناہ اس کے والدین ہی ہوتے ہیں۔ اولاد کے ساتھ نہایت محبت، شفقت اور نرمی کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ ماں کو چاہیے کہ بچے کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر سخت غصے میں آنے سے پرہیز کرے، اس طرح بچہ ماں سے زیادہ مانوس بھی ہوگا اور اس کو دیگر بہن بھائیوں کی غلطیوں کو معاف کرنے کی عادت پڑے گی۔ زیادہ سختی کرنا چاہے بچے کو ادب سکھانے کے لئے ہی کیوں نہ ہو بچے کے لئے بہت زیادہ پریشانی اور بے اعتمادی کا باعث بن جاتا ہے۔ جو بچے تشدد یا غیر مناسب برتاؤ کا نشانہ بنتے رہتے ہیں ان کی ذہنی ترقی رک جاتی ہے بلکہ پوری شخصیت ہی مسخ ہوجاتی ہے اور آگے چل کر یہ بچے معاشرے کے افراد سے متوازن تعلقات قائم کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔

ماں کو چاہیے کہ نہایت سوز اور لگن کے ساتھ اولاد کے حق میں دعا کرتی رہے۔ خدائے رحمٰن ورحیم سے توقع ہے کہ دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی پرسوز دعائیں ضائع نہ کرے گا۔

### بگاڑ کے اسباب:

یہاں چند ایسی باتوں کا ذکر کیا جارہا ہے جو اکثر بچوں میں بگاڑ اور بری عادتوں کے ظہور کا باعث بنتی

ہیں۔ بے جالاڈ پیار، بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ اور مار کٹائی، ماں کا والد کی ڈانٹ کے موقع پر بے جا شفقت کا اظہار، ماں کا کہنا کچھ اور کرنا کچھ (یعنی کہنا کہ یہ کام کیا تو سزا دوں گی اور جب بچہ کر گزرے تو یہ کہہ کر رہ جانا کہ بڑا شرارتی ہے) اولاد کو اولاد کی شکایت لگانا اور باپ کی سرزنش پر الٹا شوہر ہی سے لڑنا جھگڑنا، بچوں کی ہر ضد کو جائز یا جائز ذرائع سے پورا کرنے کی کوشش کرنا، ہر آئے گئے کے سامنے بچے کی شکایات کرنا اور شرارتوں کا رونا لے کر بیٹھ جانا، بچوں کو ہر وقت ان کی ایسی پسندیدہ کھیلوں سے روکنا جن میں کوئی شرعی یا دنیاوی قباحت بھی نہیں۔

بچوں کے ذہنوں میں عجیب عجیب سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی وقت نکال کر نہایت اطمینان اور تحقیق سے بچوں کے سوالات کے جواب دینے چاہئیں۔ اگر ڈانٹ کر ان کے سوالوں کو دبایا جائے گا تو ان میں اپنی بات کہنے کا حوصلہ پیدا نہیں ہوگا اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی ماند پڑ جائے گی۔

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اکثر والدین کی ساری توجہ صرف بچے کی مادی بہتری ہی کی طرف لگی رہتی ہے۔ اگر بچے کو آخرت کی دائمی زندگی ہی کے لیے ہی تیار نہ کیا تو پھر اس سے بڑی غفلت اور بچے کے حق میں دشمنی اور کیا ہوگی۔ ایسے والدین کی اولاد بڑی ہو کر نافرمان اور بے ادب بن جاتی ہے اور آخرت میں بھی جب تربیتِ اولاد کے متعلق سوال کیا جائے گا تو والدین ذلت و رسوائی سے نہ بچ سکیں گے۔

آخری بات:

تاتاریوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی تباہی کے بعد مسلمان عورتیں تاتاریوں کے تصرف میں چلی گئیں۔ ان مسلمان خواتین کی کوششوں ہی کے باعث تاتاریوں کے اگلی نسلوں میں اسلام پھیلنے لگا اور چنگیز اور ہلاکو کی نسل سے اسلام کے علمبردار پیدا ہوئے۔ ان عظیم خواتین نے انتہائی دل شکن اور سنگین حالات میں بھی بچوں کی تربیت میں کوتاہی نہ کی۔ انہی کے طرزِ عمل کو اپنا کر آج کی خواتین بے حیائی اور الحاد کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا رخ موڑ سکتی ہیں۔

(استفادہ: مثالی ماں، قاری ابوایوب۔ تحریکی شعور، نعیم صدیقی۔ آدابِ زندگی، محمد یوسف اصلاحی۔ حقوق العباد، بنت الاسلام)

☆☆☆

ثریا بتول علوی

# ہے کوئی جو میری حفاظت کا بندوبست کرے

سچا واقعہ

چند دن قبل ایک بہن کا فون آیا۔ بہت پریشان تھی ۔ایک خواب سنانا چاہتی تھی اوراس کی تعبیر معلوم کرنا چاہتی تھی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں آپ کواس بہن کا تھوڑا سا تعارف دے دوں۔ پہلے میرپور میں ایک سکول میں پرنسپل تھی۔ اس نے بچوں کوسکول میں مکمل دینی ماحول مہیا کیا تھا۔ پھر ریٹائر ہونے کے بعد اس نے خواتین میں بھرپور انداز میں تدریسِ قرآن وحدیث کا اہتمام کیا۔ اسی اثناء میں اس کے شوہر فوت ہوگئے۔اس کا بیٹا فوج میں تھا۔ جس کی وقتاً فوقتاً ٹرانسفر ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ اب وہ اپنے بیٹے کے ساتھ مختلف چھاؤنیوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ وہ جہاں جاتی ہے، فوجی بیگمات کو قرآن وحدیث کی کلاسوں میں شامل کرتی رہتی ہے۔ دوبار حج کر چکی ہے۔ بہت نیک اور پرہیزگار ہے۔ اب اس کا خواب سنئے۔ خواب کیا ہے،امت مسلمہ کے لئے دردمند دل کی پکار ہے۔ یہ خواب اسے کچھ دن قبل آیا تھا۔ جس کی وجہ سے انتہائی پریشانی میں اس نے رابطہ کیا۔ وہ بیان کرتی ہے۔

’’میں مسجد نبوی میں روضہ رسولؐ کے پاس کھڑی ہوں۔ وہاں اس وقت عورتوں کا زیادہ آنا جانا نہیں تھا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ روضہ رسولؐ کی طرف سے جالیاں غائب ہیں۔ وہاں صرف مٹی کی کچھ تعمیر ہے۔ مگر نبی کریمؐ تو پاس ہی ریاض الجنتہ میں لیٹے ہوئے ہیں۔ سیاہ کپڑے آپؐ نے پہنے ہیں۔ میں آپؐ کا چہرہ انور تو نہیں دیکھ پائی (ڈھکا ہوا ہونے کی وجہ سے) مگر آپؐ کے پاؤں مبارک کھلے ہیں، آپؐ بائیں ہاتھ سے بائیں ٹانگ کو کھجلا رہے ہیں۔ پاؤں اور ٹانگ کا رنگ سفید ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ آپؐ یہاں کیوں لیٹے ہوئے ہیں، کہ اتنے میں کچھ لوگ آتے ہیں اور آپؐ کا جسد مبارک اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ یہ کام اتنی جلدی میں ہوتا ہے کہ میں کچھ مزاحمت بھی نہیں کرسکتی۔ بس میں یہی کہتی جارہی ہوں کہ جسد مبارک کون لے گیا؟ یہی جملہ ، افسوس اور حسرت سے دہراتی چلی جارہی ہوں۔ اتنے میں میرا خاوند بھی آجاتا ہے۔ میں اس کو

بھی یہی دہائی دے رہی ہوں کہ جسد مبارک کون لے گیا ہے؟

اسی اثنا میں میں اس جگہ کو دیکھتی ہوں جہاں پہلے آپؐ آرام فرما تھے۔ اب وہاں کچھ خواتین اور بچیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ میں ان کو فوراً پہچان لیتی ہوں کہ یہ تو فلاں فیملی ہے۔

اسی اثناء میں میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

میں یہ خواب دیکھ کر از حد پریشان ہوں۔ شاید یہ میرے اپنے گناہوں کی شامت ہے۔ بہرحال میں نے یہ خواب اب آپ کو سنا دیا ہے تاکہ کچھ تو معلوم ہو، اس کی تعبیر کیا ہے؟

میں نے یہ خواب اپنے شوہر مولانا عبدالوکیل علوی صاحب کو سنایا ان سے تعبیر پوچھی تو انہوں نے یہی جواب دیا کہ یہ دشمنوں کی امت مسلمہ کو نقصان پہچانے کی سازشیں ہیں۔ خواب دیکھنے والی بہن کو یہ خواب فوراً اسلامی تحریکوں کے سربراہوں کو فون یا خط کے ذریعے سے پہنچانا چاہیے۔ تاکہ وہ کچھ تدارک سوچ سکیں۔

کاش اسلامی ممالک کے سربراہ اس قابل ہوتے کہ ایسے فتنوں کا ازالہ کرسکیں۔ توہین رسالت مآب ﷺ کی جو دلفگار داستانیں آج مسلسل تواتر سے دہرائی جارہی ہیں۔ اب اسلامی تحریکوں کے سربراہوں کو مل کر اس کا نوٹس لینے کی سخت ضرورت جتنی آج ہے وہ پہلے کبھی نہ تھی۔

اور پھر میرے ذہن میں کچھ مزید ایسے واقعات آنے لگے۔ اس خواب کو سننے کے بعد سوچوں کے اتھاہ سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اچانک مجھے محترم عطا اللہ صدیقی مرحوم کا لکھا ہوا مولانا ابوالحسن علی ندوی مرحوم والا واقعہ یاد آجاتا ہے۔ انہیں بھی سلمان رشدی کی ناپاک کتاب چھپنے پر ایک خواب آیا تھا۔ جس کے بارے میں مولانا عطاءاللہ صدیقی لکھتے ہیں:

ذرا آج غور فرمائیے، اکیسویں صدی کے آغاز پر امت مسلمہ کی غیرت ایمانی کی کیا صورت ہے۔ دشمنان اسلام کی گستاخیاں اور زبان درازیاں کہاں تک پہنچی ہوئی ہیں۔ جدید دور کی تمام تر روشن خیالیاں اہل یورپ کے دلوں سے پیغمبر اسلامؐ کے خلاف صلیبی بغض کی سیاہیوں کو دھو نہیں سکیں۔ تکریم آدم کے ڈھنڈورچی ایک ارب سے زیادہ مسلمانوں کی آنکھوں کے نور اور دلوں کے سرور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف ہرزہ سرائی اور سب وشتم کے مرتکب ملعون سلمان رشدی کی

حفاظت پر سالانہ کروڑوں روپے خرچ کر رہے ہیں۔ کہیں تسلیمہ نسرین جیسی گستاخ عورت کو انسانی حقوق کے نام پر پناہ دی جاتی ہے تو کہیں کسی اور شاتم رسولؐ کی پیٹھ ٹھونکی جاتی ہے۔ کہیں سلامت مسیح، رحمت مسیح جیسے گستاخانِ رسولؐ کو یورپ کی خوشنودی کے حصول کے لئے عدالتوں سے باعزت بری کروا کر فرار کرایا جاتا ہے۔

آج جناب رسالت مآب ﷺ ہمارے درمیان میں نہیں ہیں کہ ہمیں آواز دیں ''کون ہے جو میرے دشمن سے مجھے بچائے۔'' مگر کیا ہماری روحیں بھی مردہ ہو چکی ہیں جو روحِ محمدؐ کی پکار کو محسوس نہیں کر سکتیں؟ نبی مکرمؐ کے جن پروانوں کی روحیں ایمان کی تجلی سے اب بھی روشن ہیں وہ جناب رسالت مآب ﷺ کا پیغام سن رہے ہیں۔

مفکر اسلام ابوالحسن علی ندوی کا انتقال ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ کو نئی صدی کے آغاز سے چند منٹ قبل ہوا۔ ان کے حوالے سے روزنامہ جنگ (۳ جنوری ۲۰۰۰ء) میں معروف صحافی ہارون الرشید نے کالم لکھا۔ یہ کالم سید ابوالحسن علی ندوی کی خواب میں جناب رسال مآبؐ کی زیارت کی تفصیل پر مبنی ہے۔ اس خواب میں آپؐ نے مولانا ندوی صاحب سے دریافت کیا تھا کہ ''تم نے میری حفاظت کا کیا انتظام کیا؟'' یہ واقعہ ہارون الرشید کو سپریم کورٹ کے شریعت بینچ کے جج ڈاکٹر محمود احمد غازی نے سنایا، انہیں اے کے بروہی مرحوم نے سنایا تھا۔ اس کالم کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

''یہ آٹھویں عشرے کا ذکر ہے جب مدینہ منورہ سے جنرل محمد ضیا الحق کے رفیق کار جناب اے کے بروہی نے ان سے رابطہ کیا اور بتایا کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب جدہ سے بھارت جاتے ہوئے نصف دن کے لئے کراچی میں قیام کریں گے۔ وہ ایک انتہائی پیغام لے کر آ رہے ہیں لہٰذا صدر راولپنڈی سے کراچی پہنچ کر ان سے مل لیں...... جنرل ضیاء الحق نے فوراً ہی آمادگی ظاہر کی۔ حجاز سے اے کے بروہی بھی ان کے ساتھ آئے۔

مدینہ منورہ میں اے کے بروہی نے مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کو یکا یک اس حال میں دیکھا کہ اضطراب ان کے پورے پیکر سے پھوٹ رہا تھا...... ابوالحسن ندوی ایسے لوگ اپنے اضطراب کا راز بیان نہیں کیا کرتے لیکن اے کے بروہی غالباً اسی لیے

مدینہ منورہ بلائے گئے تھے کہ پیغام سنیں اور پہنچا دیں۔ ابوالحسن صاحب جنہیں محبت سے علی میاں کہا جاتا تھا، نے خواب میں سرور کائناتؐ کی زیارت کی تھی اور عالی مرتبتؐ نے ان سے خواب میں یہ پوچھا کہ انہوں نے آپؐ کی حفاظت کا کیا انتظام کیا ہے؟ جیسا کہ بعد میں علی میاں نے بیان کیا وہ مضطرب ہو کر اٹھ بیٹھے۔ لیکن کچھ دیر میں دوبارہ سوئے تو پھر سرکارؐ کی زیارت ہوئی اور آپؐ نے دوسری بار سوال کیا: تم نے میری حفاظت کا کیا انتظام کیا ہے؟

رسول اللہؐ کے دونوں امتی اضطراب، حیرت، رنج اور تعمیل کی آرزو کے ساتھ بہت دیر تک اس سوال پر غور کرتے رہے کہ سرکارؐ کے ارشاد کا مفہوم کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ نورالدین زنگی کا معاملہ نہ تھا جب دو بدبخت یہودیوں نے مرقد مبارک میں نقب لگانے کی جسارت کی تھی۔ اب اس اشارے کا مفہوم کچھ اور تھا۔ آخرکار وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس معاملے کو عالم اسلام کی سب سے بڑی سپاہ کے سردار جنرل ضیاء الحق کے سپرد کر دیا جائے۔ انکے نزدیک اس پیغام کا مطلب یہ تھا کہ سرکارؐ کی سرزمین بالخصوص اور عالم اسلام بالعموم خطرات سے دوچار ہے...... ایک سادہ، سچے اور کھرے آدمی نے، سارا عرب جس کے حسن بیان کا مداح تھا، صاف اور آسان الفاظ میں خواب دہرایا...... خواب بیان کرتے ہوئے ۸۳ سالہ عالم دین رو دیا۔ گداز اور درد کی شدت سے شاید اس کا پورا پیکر کانپ رہا ہوگا۔ بروہی روئے اور محمد ضیاء الحق بھی روئے کہ دونوں گریہ کرنے والے آدمی تھے۔ لیکن جنرل کے لئے یہ فیصلے کی ساعت تھی وہ زیادہ دیر رو نہ سکتا تھا۔ پانچ لاکھ فوج اور ایٹمی پاکستانی کے سربراہ نے اپنے آنسو پونچھے، پھر انکسار اور عاجزی لیکن محکم لہجے میں انہوں نے کہا اگر آنجناب کو پھر حضورؐ کی زیارت نصیب ہو تو نہایت ادب سے عرض گزاریں کہ پاکستانی فوج کا آخری سپاہی تک کٹ مرے گا لیکن مدینہ منورہ اور حرمین شریفین پر آنچ نہ آنے دے گا۔''

(روزنامہ جنگ ۳ جنوری ۲۰۰۰ء)

مولانا علی میاں اور جناب اے کے بروہی نے رسالت مآبؐ کے ارشادِ مبارکہ کی جو تعبیر نکالی ممکن ہے وہ درست ہو، لیکن راقم الحروف کا ذہن ایک دوسری تعبیر کا میلان رکھتا ہے۔ جناب ہارون الرشید کے بقول جب مولانا علی میاں نے خواب میں نبی کریم کی زیارت کی تو اس وقت ان کی عمر ۷۳ سال تھی ۔

۳۱دسمبر۱۹۹۹ء کو جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی عمر۸۴برس کی تھی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ خواب گیارہ سال قبل یعنی ۱۹۸۸ء کے دوران دیکھا گیا۔۱۹۸۸ء میں ملعون رشدی ''شیطانی آیات'' مکمل کر چکا تھا یا غالباً اس کا پہلا ایڈیشن مارکیٹ میں آچکا تھا۔مولانا ابوالحسن علی ندوی قلمی میدان کے عظیم شہسوار تھے،حضور اکرم ﷺ کا خواب میں ان سے یہ سوال ''تم نے میری حفاظت کا کیا انتظام کیا ہے؟''اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ مولانا علی میاں نے شاتم رسول ملعون رشدی کی ہرزہ سرائی اور زبان درازی سے آپؐ کی حفاظت کا کیا انتظام کیا۔آپؐ کا مولانا علی میاں سے یہ تقاضا ان کے ادیب ہونے کی وجہ سے زیادہ قرین قیاس ہے۔ظاہر ہے کہ وہ کسی ملک کے حکمران نہیں تھے کہ جن سے سعودی عرب یا عالم اسلام کی حفاظت کا تقاضا کیا جاتا۔لفظی اورمعنوی اعتبار سے جناب رسالت مآبؐ کا یہ سوال حضرت حسان بن ثابتؓ کو کافروں کے ہجویہ اشعار کے مقابلے میں حضور اکرم ﷺ کی مدح سرائی کے حکم سے خاصی مشابہت رکھتا ہے۔حضرت ابوالحسن ندوی صاحب جیسے صاحبِ قلم،محبِ رسولؐ سے یہ بجا طور پر توقع تھی کہ وہ ملعون رشدی کی خرافات کا جواب لکھیں۔مزید برآں مذکورہ سوال کے الفاظ حضور اکرمؐ کے ارشادات ''کون ہے جو میرے دشمن سے مجھے بچائے؟'' سے بھی خاصی مشابہت رکھتے ہیں اور یہ سوال بھی آپؐ اکثر کسی شاتم رسول سے تحفظ دلانے کے لئے صحابہؓ سے فرماتے تھے۔(واللہ اعلم بالصواب)

راقم الحروف کا مولانا ابوالحسن علی ندوی کے خواب کی تعبیر کے متعلق میلان غالب یہی ہے۔ اگر اس خواب کی یہی تعبیر درست ہے تو راقم الحروف کو یقین کامل ہے کہ آج کے دور میں حبِ رسول کا عظیم ترین تقاضا یہ ہے کہ حسان بن ثابتؓ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے سرور کونین، خاتم الانبیاء حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ مقدسہ کے خلاف شیطانی ذریت ملعون رشدی اور دیگر شاتمان رسول کی مکروہ زبان درازیوں کا مقدور بھر جواب دیا جائے۔اور سیرت رسولؐ کی عالم کفر میں بھرپور اشاعت کی جائے تاکہ اسلام کے خلاف کی جانے والی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا موثر جواب دیا جاسکے۔ پیغمبر اسلامؐ کے خلاف کی جانے والی یہ سازشیں یہود و نصاریٰ کی بدحواسی کی غماز ہیں۔اسلام یورپ اور دنیا کے دیگر ممالک میں بڑی تیزی سے پھیل

رہا ہے۔ اسلام کی اشاعت میں ایک بہت بڑی رکاوٹ متعصب مسیحی وصیہونی مصنفین کا جناب رسالت مآبؐ کی ذات بابرکات کے بارے میں غلط تاثر قائم کرنا بھی ہے۔ جونہی یہ تاثر ختم ہوگیا تو پھر یورپ اورامریکہ اسلام کی جھولی میں پکے پھل کی طرح آ گریں گے اور قیامت سے پہلے پوری دنیا پر اسلام کے غلبہ کی پیشین گوئی عملی صورت بن کر سامنے آئے گی۔

اگر ہم حقوق الرسولؐ کو ام الحقوق مانتے ہیں تو پھر اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں برتنی چاہیے۔آج سسکتی ہوئی انسانیت کو جس آفاقی منشور کی ضرورت ہے اس کا سرچشمہ صرف ایک ہے اور وہ ہے سیرت سرور دوعالمؐ......یعنی ام الحقوق کی پاسداری۔

(ام الحقوق، ناموس رسالتؐ کا تحفظ از عطاء اللہ صدیقی مرحوم، ماہنامہ محدث لاہور جون۲۰۰۰ء ۔۴۱،۴۲،۴۳)

اب آپ کے سامنے نورالدین زنگیؒ کا واقعہ پیش خدمت ہے جس نے روضہ رسول پاکؐ کی حفاظت کا کام بڑے اہتمام سے انجام دیا تھا۔نورالدین زنگی کا دورحکومت 1147ء سے 1174ء تک تھا۔یہ صلیبی جنگوں کا دور تھا، اور نورالدین چونکہ اس وقت مصر و شام کا حکمران تھا اور صلیبیوں سے برسرپیکار تھا۔ یہ صلیبی مسلمانوں کو ہر طرح سے زک پہنچانے میں مصروف تھے کہ اسی دوران روضہ رسول پاکؐ میں نقب زنی کا مکروہ واقعہ پیش آیا۔محمد اسماعیل قریشی لکھتے ہیں:

<u>سلطان نورالدین زنگی اور روضہ رسولؐ:</u>

سلطان نورالدین زنگی کے زمانے میں نقب زنی کی ناپاک جسارت کی گئی مگر اللہ تعالیٰ جل مجدہ نے شرپسندوں کو منصوبہ خاک میں ملا دیا۔سلطان کو خواب میں حضور سرورکونینﷺ کی زیارت نصیب ہوئی اور آپؐ نے دو آدمیوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ ان سے میری حفاظت کرو۔ سلطان کو سخت تشویش ہوئی، اٹھ کر وضو کیا۔نفل ادا کیے مگر جونہی لیٹے پھر وہی خواب دیکھا غرضیکہ تین دفعہ ایسا ہوا تو آپ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اپنے وزیر جمال الدین کے مشورے پر فوراً مدینہ کی تیاری شروع کردی۔سولھویں دن مدینہ طیبہ پہنچے۔ ریاض الجنۃ میں تحیۃ المسجد ادا کرنے کے بعد سوچنے لگے کہ حصول مقصد کیلئے کیا تدبیر اختیار کرنی چاہیے۔آخر وزیر نے اعلان کیا کہ بادشاہ مدینہ منورہ میں تشریف لائے ہیں۔ وہ اہل مدینہ کو انعامات سے

نوازیں گے۔ ہر شخص حاضر ہوکر اپنا حصہ لے لے۔ ایک ایک آدمی آتا گیا، بادشاہ انعامات تقسیم کرتا رہا۔ وہ ہر شخص کو بغور دیکھتا اور خواب میں نظر آنے والی شکلوں کو تلاش کرتا رہا حتیٰ کہ مدینہ کے تمام لوگ گزر گئے مگر مجرمین کا کھوج نہ لگایا جاسکا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ کوئی رہ گیا ہو تو حاضر کیا جائے۔ بڑی سوچ بچار کے بعد بادشاہ کو بتایا گیا کہ صرف دو شخص ہیں جو نہایت متقی پرہیزگار ہیں۔ انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر رکھی ہے۔ ہر وقت عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے ہیں۔ بادشاہ نے انہیں بھی طلب کرلیا اور انہیں ایک نظر دیکھتے ہی پہچان لیا۔ پوچھا ''کون ہو؟ اور یہاں کیوں پڑے ہوئے ہو؟'' انہوں نے بتایا کہ ہم مغرب کے رہنے والے ہیں حج کے لئے آئے تھے۔ روضہ انور کی زیارت کے لئے مدینہ آئے تو حضورؐ کے پڑوس میں رہنے کے شوق میں یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ بادشاہ ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر ان کی رہائش گاہ پر پہنچا، جو ایک قریبی سرائے میں تھی، مگر وہاں کوئی مشکوک چیز نظر نہ آئی۔ جس کی وجہ سے بادشاہ مزید پریشان ہوگیا۔ مدینہ پاک کے لوگوں نے ان کی صفائی میں بہت کچھ کہا کہ یہ تو نہایت پرہیزگار لوگ ہیں۔ ریاض الجنتہ میں نماز پڑھتے ہیں۔ روزانہ جنت البقیع کی زیارت کرتے ہیں اور ہر ہفتہ کو قبا میں نفل ادا کرتے ہیں۔ یہ قائم اللیل اور صائم النہار ہیں۔ اس سے بادشاہ کی تشویش میں اور اضافہ ہوگیا۔ دفعتاً بادشاہ کے دل میں کچھ خیال آیا اور اس نے ان آدمیوں کے مصلیٰ کو الٹ دیا۔ ان کا مصلیٰ ایک پتھر کے اوپر تھا اور جب پتھر اٹھایا گیا تو نیچے سرنگ نمودار ہوئی جو دور تک روضہ انور کے قریب پہنچ چکی تھی۔

بادشاہ نے اس کمینہ حرکت کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ عیسائی ہیں اور عیسائی بادشاہوں نے انہیں بیش بہا دولت دے کر اس کام پر مامور کیا ہے کہ کسی طرح وہ حضور نبی کریمؐ کے حجرہ مقدسہ میں داخل ہوکر آپؐ کا جسم اطہر یہاں سے نکال لے جائیں۔ ان کا طریقہ واردات یہ تھا کہ رات بھر سرنگ کی کھدائی کرتے اور مشکوں میں مٹی بھر کر بقیع کے مضافات میں ڈال آتے۔ سلطان نورالدین زنگیؒ یہ باتیں سن کر آتش غضب سے بھڑک اٹھا۔ ساتھ ہی رقت بھی طاری ہوگئی کہ اسے اس کام پر آپؐ کی طرف سے مامور کیا گیا۔ چنانچہ ان دو عیسائیوں کو صبح کے وقت قتل کرا دیا اور شام کے وقت ان کی ناپاک لاشوں کو نذر آتش کر کے خاکستر

کر دیا گیا۔اس کے بعداس بیدار بخت بادشاہ نے حجرہ پاک کے چاروں طرف اتنی گہری بنیادوں کو سطح زمین تک سیسے سے بھر دیا کہ آئندہ کسی ملعون کو نبی پاک ؐ کی لحد مبارک تک رسائی کے قصد کا موقع نہ مل سکے۔

پھر نورالدین زنگی کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی نے صلیبی جنگوں کا جواب دیا۔

<u>صلاح الدین ایوبی اور عیسائی بادشاہ ریجی نالڈ کا عبرت آموز واقعہ:</u>

صلاح الدین کا سن پیدائش 1138ء ہے۔اس کا تعلق ایک معزز قبیلہ سے تھا۔قرون وسطیٰ میں اس کی شہرت ایک بہادر نا قابل تسخیر حکمران جنرل کی طرح مشرق اور یورپ میں پھیل گئی۔اس نے مسلمانوں میں جذبہ جہاد کی نئی روح پھونک دی اور اپنے شب وروز جہاد کے لیے وقف کر دیئے۔اسلامی فقر وسادگی کو اپنی زندگی کا شعار بنا لیا۔ بے قاعدہ فوجوں کو ڈسپلن اور نئی جنگی تکنیک سے منظّم کیا۔۱۲اکتوبر۱۱۸۷ء کو وہ مبارک ساعت نمودار ہوئی جب صلاح الدین کے ہاتھوں عیسائی فوجوں کو ۸۸سال بعد ذلت آمیز شکست ہوئی۔ جب یہ مسلمان فاتح ارضِ مقدس یروشلم میں داخل ہوا تو عیسائی مورخین بیان کرتے ہیں کہ دنیا نے ایک نا قابل یقین تضاد کا منظر دیکھا ایک منظر تو وہ تھا جب یورپ کی عیسائی فوجیں صلیبی جنگ کے پرچم تلے یروشلم میں نوے سال قبل داخل ہوئیں تو سارے شہرے میں ہر طرف انسانی لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے اور سڑکیں خون کی ندیاں بن گئی تھیں لیکن صلاح الدین جب داخل ہوا تو بالکل برعکس منظر تھا۔ اسکی فوجیں نہایت شریفانہ طریقہ سے شہر میں داخل ہوئیں پہلے مسجد اقصیٰ میں نماز شکرادا کی گئی۔عورتوں، بچوں، بوڑھوں کو اور جنہوں نے ہتھیار ڈال دیئے ان سب کو امان دی گئی۔ کوئی خون خرابہ نہیں ہوا۔ اس مرد مجاہد کا ذکر مورخین نے سنہری الفاظ میں کیا ہے۔خود ایک عیسائی مورخ سٹینلے لین پول یہ ذکر کرتا ہے کہ جب صلیبی یروشلم میں فاتحانہ داخل ہوئے تھے تو انہوں نے بہت زیادہ قتل وغارتگری کی تھی۔ان کے وحشیانہ قتل عام سے ان کے اپنے گھوڑوں کے سم شہر کی گلیوں سے گزرتے ہوئے اہل شہر کے خون میں ڈوبے ہوئے تھے مگر جب سلطان فاتحانہ یروشلم میں داخل ہوا تو ایک قطرہ خون کا بھی نہ گرا بلکہ عام معافی کا اعلان کر دیا گیا۔

مگراسی رحم دل اور فیاض حکمران نے ایک گستاخِ رسول کے صلیبی حاکم والیِ کرک ریجی نالڈ کے ساتھ جو

معاملہ کیا وہ بھی تاریخ کے صفحات پر بڑی تفصیل سے موجود ہے۔

واقعہ اس طرح ہے کہ تیسری صلیبی جنگ کے دوران ریجی نالڈ والیِ کرک نے سلطان صلاح الدین سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے علاقہ سے گزرنے والے مسلمان تاجروں کے قافلوں کو کوئی گزند نہیں پہنچائے گا۔ بعد میں اس نے وعدے کا پوری طرح پاس نہ کیا، مگر صلاح الدین نظرانداز کرتا رہا۔ جب ریجی نالڈ نے 1186ء میں مسلمان تاجروں کے قافلہ کو لوٹ لیا اور سارے اہل قافلہ کو گرفتار کرلیا، لٹے پٹے مسافروں نے درخواست کی کہ وہ انہیں رہا کردے تو ان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا ''تم محمدؐ پر ایمان رکھتے ہو اب بلاؤ اپنے محمدؐ کو، وہ آکر تمہیں چھڑالے۔'' وہ اس سے پہلے بھی اس طرح کی نازیبا باتیں کرتا رہتا تھا۔ مثلاً اسی نے ایک موقع پر یروشلم میں داخلے کے وقت اپنی فوجوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ ''اے صلیبی فوجیو! فتح یروشلم کوئی ایسا بڑا واقعہ نہیں جس پر تم فخر کرو۔ یہ شہر تو ہمارا ہی تھا۔ ہم سے عمرؓ نے چھین لیا تھا۔ اب ہم نے واپس لے لیا تو کیا ہوا۔ ہماری اصل منزل تو مدینہ ہے جہاں مسلمانوں کے نبیؐ کی قبر ہے۔'' نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ (شاید اسی واقعہ کے بعد نورالدین زنگی کے عہد میں روضہ رسولؐ میں نقب زنی کی گستاخ حرکت کی گئی جسے اللہ پاک نے اپنی مہربانی سے نورالدین زنگی کے ہاتھوں ناکام بنادیا تھا)

1187ء میں معرکہ حطین میں صلیبیوں کے خلاف زبردست کامیابی کے بعد سلطان صلاح الدین نے دشمن سے جس رواداری کا اور عام معافی کا معاملہ کیا۔ وہ سب پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اسی موقع پر یروشلم کا بادشاہ گامی، والی کرک عہد شکن اور گستاخ رسول ریجی نالڈ بھی ان کے دوسرے نائٹس اور حاکم بھی جنگی قیدی کی حیثیت سے بادشاہ کے سامنے پیش کیے گئے۔

اس نے باقی سب کو تو عزت وتکریم دی۔ مگر ریجی نالڈ کو اپنے سامنے طلب کیا اور اس کو اس کی عہد شکنی، مسلمانوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک خصوصاً پیغمبر اسلامؐ کی شان میں گستاخی وغیرہ کے واقعات یاددلائے۔ اور کہا ''خدا کی قسم میں نے کسی جنگی قیدی کو اذیت پہنچانے یا کسی قیدی کا قطرہ خون گرانے کا کبھی ارادہ نہیں کیا۔ اللہ گواہ ہے کہ میں تمہارے دیگر جنگی جرائم کو نظرانداز کرسکتا ہوں مگر گستاخی رسولؐ کا یہ جرم ناقابل معافی ہے۔ اب میں اپنے پیغمبرؐ کی گستاخی کے جرم میں

تمہارا سر قلم کرتا ہوں کہ یہ جرم نا قابل معافی ہے۔'' یہ کہہ کر خود اپنے ہاتھ سے اس کا سرتن سے جدا کر دیا جبکہ باقی تمام عیسائی سرداروں کو عزت واحترام سے رخصت کر دیا۔

اس طرح اس سچے محبّ رسولؐ نے واضح کر دیا کہ گستاخ رسولؐ کی سزا سزائے موت ہے۔اور یہ سزا اسکی ساری سلطنت میں نافذ تھی۔ یہ تھا اپنے وقت میں اسلامی دنیا کا طاقتور ترین حکمران جس نے صلیبیوں کو اپنی زندگی میں 1186ء سے لے کر 1192ء تک ناکوں چنے چبوائے اور دُم دبا کر یورپ بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ہر موقع پر بے مثال فیاضی سے کام لیتا رہا مگر گستاخ رسولؐ کو اس نے اپنے ہاتھوں سے واصل جہنم کرنا ضروری خیال کیا تھا۔

(ملخّص ناموس رسالتؐ اور قانون توہین رسالتؐ از محمد اسماعیل قریشی 267 تا 271)

## زکریا خاں اور حقیقت رائے کا ذکر

برصغیر ہندو پاک میں بھی توہین رسالتؐ کرنے والے کی اسلامی شرع کے مطابق سزا سزائے موت مقرر تھی۔ اور اس سزا سے کسی کو مفر نہ تھا۔ چنانچہ 1734ء میں پنجاب کے مسلم حکمران زکریا خان کے پاس ایک ہندو پندرہ سالہ لڑکا لایا گیا جس نے کلاس میں بیٹھ کر اپنے استاد کے سامنے توہین رسالتؐ بھی کی اور حضرت فاطمہؓ کے بارے میں بھی بُرے کلمات کہے۔ شرع کے مطابق جب اس کو سولی چڑھانے لگے تو ہندوؤں سکھوں نے مل کر اس کی سفارش کرنا چاہی۔ مگر اس نے کہا یہ سزا میں معاف کرنے والا کون ہوتا ہوں؟ چنانچہ اسے حضرت فاطمہؓ کیخلاف بولنے پر پہلے کوڑے لگائے گئے پھر نبی کریمؐ کے خلاف بولنے پر سولی چڑھایا گیا۔ بعد میں ہندو، سکھوں دونوں نے اس سزا پر بڑا احتجاج کیا اور اس جگہ کو شہید قرار دے کر اس کا مندر بھی تعمیر کر دیا جو بعد میں ختم ہو گیا۔ مگر پھر اسی کی یاد میں ہندو وہاں بسنت کی پتنگیں اڑانے لگے۔

مگر یہ مسئلہ یہ ہے کہ وہ مسلم حکمران باغیرت بھی تھے اور بااختیار بھی تھے، وہ یہ شرعی سزا نافذ کرتے رہے، جبکہ موجودہ مسلم حکمران ایک تو لبرل اور سیکولر ہیں دوسرا وہ مغرب کے ایجنٹ اور ان کے حاشیہ بردار ہیں۔ وہ یہ سزا دینا نہیں چاہتے۔

بیشک قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے: **وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ)**:

''اللہ تعالیٰ آپؐ کو لوگوں کے شر سے بچانے والا

ہے۔''

دوسری طرف اس بات پر بھی یقین ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی طرح (جب انہی بد بخت یہودیوں نے آپ کو مصلوب کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیلؑ کو بھیج کر ان کو آسمانوں پر اٹھا لیا تھا اس طرح آپ کے جسد مبارک کو یہودیوں کی سازشوں سے محفوظ فرمایا تھا کیونکہ ''وَمَكَرَ اللّٰهُ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ۔(آل عمران:54)

پھر بنی اسرائیل حضرت عیسیٰؑ کے خلاف خفیہ تدبیریں کرنے لگے، جواب میں اللہ نے بھی اپنی خفیہ تدبیر کی اور اللہ ایسی تدبیروں میں سب سے بڑھ کر ہے۔اسی طرح وہ ہمارے رسول پاکؐ کی اور سرورِ کائنات کی اس دنیا میں بھی دشمن سے حفاظت فرماتا رہا اور تا قیامت وہ آپؐ کے جسدِ مبارک کی حفاظت فرمائے گا اور اسی قبر سے روزِ قیامت اٹھیں گے۔ان شاء اللہ یہی آپ کی تا قیامت آخری آرام گاہ رہے گی۔مگر دشمنوں کی ناپاک سازشیں تو اپنی جگہ ہیں اور ان سازشوں کا توڑ کرنا ہم مسلمانوں کی ہی ذمہ داری ٹھہرتی ہے۔ہم اس سے بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ امام مالکؒ کا فرمان ہے کہ ''اس قوم کو زندہ رہنے کا کیا حق ہے جس کے رسولؐ کو سبّ وشتم کیا جائے؟؟

☆☆☆

# بھارت میں صنف نازک جنسی تشدد کا شکار

بھارت صنف نازک کیلئے کبھی بھی محفوظ ملک نہیں رہا۔لیکن اب یہ ان کیلئے بے حد خطرناک ہوتا جا رہا ہے جہاں درندوں کی شکل میں مرد عورتوں کا شکار کرنے کے لئے گلیوں میں پھرتے ہیں اور نا صرف انہیں لوٹ لیتے ہیں بلکہ اجتماعی جنسی تشدد کا نشانہ بھی بناتے ہیں۔ بھارت میں جنسی تشدد خواتین کے لئے سب سے خطرناک چیلنج بن چکا ہے اور ان خواتین میں غیر ملکی خاتون سیاح بھی شامل ہیں۔

ایسی ہی ایک تازہ ترین واردات میں ایک چارسالہ ایرانی بچی جو اپنی ماں کے ساتھ بھارتی ریاست گوا میں چھٹیاں منانے آئی ہوئی تھی۔ ایک ۳۲ سالہ درندے کی ہوس کا شکار ہوگئی۔

عیسائی اکثریت والی یہ ریاست جو کہ اس سے پہلے پرتگال کی نوآبادی تھی۔ منشیات کی وجہ سے بھی بدنام ہے لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ بھارت میں بس یہی ایک خطرناک علاقہ ہے۔

ایرانی بچی کے ساتھ یہ واقعہ ۲۲ جنوری کو ایک شمالی قصبے آر پورا میں پیش آیا جہاں مجرم کا گھر تھا اور کچھ ایرانی سیاح بھی وہاں قیام پذیر تھے۔معصوم بچی نے اپنی ماں کو اس واقعہ کی خبر واردات کے کچھ دنوں بعد دی جس نے فوراً پولیس میں رپورٹ درج کرائی اور 27 جنوری کو مجرم کو گرفتار کرلیا گیا۔ پولیس انسپکٹر پریش نائک نے اس گرفتاری کا اعلان کرتے ہوئے بتایا کہ پولیس نے مجرم کی تلاش فوراً ہی شروع کر دی تھی اور اگرچہ اس نے شکایت درج ہونے کا سن کر فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن اسے پکڑ لیا گیا۔

اس ایرانی بچی کے ساتھ یہ واقعہ اس روز پیش آیا جس روز مغربی ہنگال کے ضلع بیربم میں ایک ۲۲ سالہ لڑکی کو ۱۳ مردوں نے جنسی تشدد کا نشانہ بنایا یہ واقعہ اس لیے پیش آیا کہ اس کے گاؤں کی ویلیج کونسل نے اس لڑکی کے ساتھ جنسی تشدد کرنے کا حکم دیا تھا کیوں کہ اس نے اپنے قبیلے سے باہر کے ایک نوجوان سے تعلقات استوار کر لیے تھے۔ اس واقعہ کے بعد اپنی جان کے خوف سے یہ لڑکی اپنے گاؤں سے فرار ہو کر کسی اور جگہ

پناہ تلاش کرتی رہی۔

مغربی بنگال کی عورتوں اور بچوں کی بہبود کی وزیر ششی پنجانے بتایا کہ وہ لڑکی اب اسی ضلع کے ایک دوسرے گاؤں میں جانا چاہتی ہے جہاں اس کے چچا کی رہائش ہے۔ وہ اب واپس اپنے گاؤں جانے سے سخت خوفزدہ ہے کیوں کہ گاؤں والے بھی اسے واپس آنے نہیں دینا چاہتے۔ اس لڑکی کا کنبہ بھی اب تک پولیس کی حفاظت میں وہاں رہ رہا ہے۔

پولیس ذرائع کا کہنا ہے کہ ان تیرہ مجرموں کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ اس جرم کا نشانہ بننے والی لڑکی نے بھارتی معیار کے خلاف غیر معمولی قدم یہ اٹھایا کہ اس نے پولیس میں رپورٹ درج کرادی۔ اسے بیر بم کے ایک ہسپتال میں طبی معائنہ کیلئے لے جایا گیا جہاں ڈاکٹر نے اس کے ساتھ ہونے والے جنسی تشدد کی تصدیق کردی۔ اس خبر سے بھارت میں اور باہر کی دنیا میں غصے کی لہر دوڑ گئی۔

پولیس کے جمع کیے ہوئے اعداد وشمار کے مطابق بھارت میں ہر سال ۲۴۰۰۰ جنسی تشدد کے واقعات ہوتے ہیں۔ سوشل ورکرز اور خواتین کے معاملات سے متعلق ذمہ دار افراد کا کہنا ہے کہ یہ تعداد اصل میں رونما ہونے والے واقعات سے کہیں کم ہے۔ زیادہ تر عورتیں ایسے واقعات کو چھپا جاتی ہیں کیوں کہ یہ ان کے خاندان کیلئے بدنامی کا باعث ہوتے ہیں۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے خود خاندان والے یا گاؤں کے لوگ ایسی عورتوں کو گاؤں سے نکال دیتے ہیں۔

گزشتہ ماہ جنوری ۲۰۱۴ء میں بھارت میں غیر ملکی عورتوں کے ساتھ جنسی تشدد کے پے در پے کئی واقعات پیش آئے۔ ۱۴ جنوری کو دہلی میں ڈنمارک کی ایک ۵۱ سالہ خاتون سیاح کا واقعہ دنیا بھر کے اخبار کی سرخیوں میں رپورٹ کیا گیا۔ وہ اپنے ہوٹل کا راستہ بھول گئی تو اس نے چند بے خانماں مردوں سے راستہ پوچھا۔ اس کو راستے بتانے کی بجائے چھ آدمی اس سے تین گھنٹے تک اس پر جنسی حملے کرتے رہے۔ اس سے نقدی اور سیل فون بھی چھین لیے گئے۔

یہ واقعہ دہلی شہر کے قلب میں سٹیٹ انٹری روڈ پر ریلوے آفیسرز کلب کی گراؤنڈ میں درختوں کے ایک جھنڈ میں پیش آیا۔

ڈنمارک کی یہ خاتون سیاح زخمی حالت میں اپنے ہوٹل پہنچی۔ ہوٹل استقبالیہ کے ایک کارکن نے بتایا کہ وہ بہت بری حالت میں واپس آئی تھی اور اس نے ہم سے

۲۰۰ روپے ٹیکسی ڈرائیور کو دینے کیلئے مانگے۔ اس کے بعد اس نے سارا واقعہ بتایا۔ اس نے اپنا طبی معائنہ کرانے سے انکار کر دیا لیکن اس واقعے کی وجہ سے وہ زخموں سے چور تھی۔ اس نے ڈنمارک کے سفیر فریڈی سوین کی موجودگی میں پولیس کو اپنا تفصیلی بیان ریکارڈ کرایا۔ اس کے بعد وہ فوراً بھارت سے چلی گئی۔ دہلی پولیس کے مطابق انہوں نے اس واردات میں ملوث نوجوانوں کا ایک گروہ شناخت کر کے اسے گرفتار کر لیا ہے۔

ڈنمارک کی اس خاتون کے واقعہ سے پہلے پولینڈ کی ایک خاتون کے ساتھ بھی ایسا واقعہ پیش آیا۔ اسے گزشتہ ماہ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے بیہوش کر کے اس وقت جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جب وہ اپنی دو سالہ بچی کے ساتھ دہلی جا رہی تھی۔ بھارت میں ایسے واقعات تمام ملک میں کثرت سے ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن دہلی میں میڈیا والوں کی بھاری نفری موجود ہونے کی وجہ سے یہاں کے واقعات لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ بھارت کے ایک اخبار ہندوستان ٹائمز کے ۱۵ جنوری کے شمارے میں شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق ایک مشرقی شہر رانچی میں آٹھ مردوں نے ایک سکول کی طالبہ کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس دوران اس کے دوست لڑکے کو انہوں نے رسیوں سے باندھ دیا تھا۔ اس سے پہلے دسمبر ۲۰۱۳ء میں ایک جج نے تین نیپالی شہریوں کو بیس سال قید کی سزا سنائی جنہوں نے جون کے مہینے میں ایک امریکی سیاح خاتون کو اجتماعی درندگی کا نشانہ بنایا تھا۔ یہ واقعہ بھارت کی ایک شمالی ریاست ہماچل پردیش میں پیش آیا۔ اسی سال جولائی میں مدھیہ پردیش کی ریاست میں عدالت نے چھ آدمیوں کو اس جرم میں عمر قید کی سزا سنائی کہ انہوں نے سوئیزرلینڈ کی ایک ۳۹ سالہ سائیکلسٹ سیاح کو نا صرف لوٹا بلکہ اسے جنسی تشدد کا نشانہ بھی بنایا۔

ایک اور واقعہ جس نے پورے ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں اضطراب کی لہریں بکھیر دی تھیں۔ ایک خاتون طالب علم کی عصمت دری کا واقعہ تھا جو دسمبر ۲۰۱۲ء میں پیش آیا۔ جب یہ طالبہ اور اس کا نوجوان ساتھی رات گئے دہلی کی ایک بس میں سوار ہوئے تو دونوں کو بری طرح مارا پیٹا گیا اور کئی مردوں نے بس کے اندر ہی بار بار اس لڑکی پر جنسی تشدد کیا۔ اس کی شرمگاہ میں لوہے کا سریا بھی داخل کیا گیا جس سے وہ اتنی زخمی ہوگئی کہ بعد میں جانبر نہ ہوسکی۔ اس پر

سارے بھارت میں احتجاج کی لہر دوڑ گئی اور کئی ہفتوں تک اس لڑکی کی زندگی بچنے کی دعائیں کی گئیں۔عوام نے مجرموں کیلئے موت کی سزا کا مطالبہ کیا۔جنہیں دہلی کے پسماندہ علاقے سے گرفتار کیا گیا تھا۔

اس واقعہ کے ایک سال بعد دسمبر ۲۰۱۳ء میں بھارت کی آبادی کے ہر طبقے نے اس لڑکی کی پہلی برسی منائی تاکہ اس واقعے کو فراموش نہ کیا جاسکے۔ یہ واقعہ ایک طرح سے دنیا بھر میں۔اس لڑکی کی یاد منانے کی وجہ سے بن گیا۔لیکن اس المناک واقعے نے بھی بھارت میں عورتوں کے ساتھ شرمناک سلوک کے خلاف کسی ٹھوس پیش رفت میں کوئی کردار ادا نہ کیا۔جنسی تشدد کے خلاف زیادہ سخت قانون سازی کرنے کی تحریکیں بھی بے نتیجہ ثابت ہوئیں کیوں کہ پارلیمنٹ کے بہت سے ممبر خود بھی اس طرح کے جرائم میں ملوث ہیں۔وہ پارلیمنٹ میں براجمان ہونے کی وجہ سے ہر قسم کی قانونی کارروائی سے محفوظ ہیں۔

ہندو تہذیب میں عورتوں کے ساتھ بے حد توہین آمیز سلوک کیا جاتا ہے۔ بہت سی عورتوں کو دیوداسیوں کا نام دے کر ہندوستان میں جسم فروشی کیلئے بٹھا دیا جاتا ہے جو وہاں پر موجود پنڈتوں اور پجاریوں کی جنسی تسکین کا سامان بنتی ہیں۔ ہندو مذہب بذات خود شرمناک علامات کے گرد گھومتا ہے جس میں عورتوں (دیویوں) کے برہنہ مجسمے نمایاں طور پر مندروں میں نمائش کیلئے رکھے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہندو تہذیب کا ایک اور ہولناک پہلو یہ ہے کہ اگر کسی عورت کا شوہر مرجائے تو اسے اسی بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ بھی شوہر کی اس چتا میں زندہ جل مرے جو اس کے مردہ جسم کو جلانے کیلئے تیار کی جاتی ہے۔ اس رسم کو ”ستی“ کہا جاتا ہے۔ ہندو مذہب کی یہ قدیم رسم برطانوی نوآبادی کے دور میں انگریز حکومت نے ۱۸۲۹ء میں ممنوع قرار دے دی تھی،لیکن اس کے باوجود بھارت کے دور دراز دیہات میں پھر بھی اس پر عمل ہوتا رہا۔

۱۹۸۷ء میں ایک اٹھارہ سالہ بیوہ روپ کنور کا واقعہ بین الاقوامی اخباروں کی سرخیوں میں بیان ہوا۔۴ ستمبر کو ریاست راجستھان کے ضلع سکار کے ایک گاؤں دیووالا میں اسے مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے مردہ شوہر کی چتا پر خود کو بھی قربانی کی بھینٹ چڑھا دے۔نیویارک ٹائمز ۲۰ ستمبر ۱۹۸۷ء کی رپورٹ کے مطابق شوہر کی موت کے وقت یہ لڑکی صرف ۱۸ سال کی تھی اور اس کی

شادی صرف آٹھ ماہ پہلے نوجوان مال سنگھ سے ہوئی تھی جو۲۴سال کی عمر میں مر گیا تھا۔عینی گواہوں کا بیان ہے کہ کنور کواس کی چیخ پکار کے باوجود لوگوں نے زبردستی آگ میں دھکیل دیا تھااور اس کی وہاں سے نکلنے کی کوشش بھی کامیاب نہ ہوسکی۔

ستی ہونے کا یہ منظر ہزاروں لوگوں نے دیکھا۔ اس کے جل مرنے کے بعد اسے ''ستی ماتا'' (مقدس ماں) کا خطاب دیا گیا۔ اس واقعے نے شہری آبادی میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور جدید ذہن کے لوگ ان روایتی ہندوؤں کے خلاف بولنے لگے جنہوں نے یہ انتہائی ظالمانہ اقدام کیا تھا۔اس واقعے کے بعد پہلے تو ریاستی سطح پر ایسے واقعات روکنے کے لئے قانون سازی کی گئی ۔پھر مرکزی سطح پر بھی ستی کی روک تھام کے قانون کی تجدید کی گئی۔لیکن ایسے قوانین دوردراز علاقوں میں ستی کی رسم کو مکمل طور پر ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے اگر چہ اب ایسے واقعات بہت کم ہو گئے ہیں۔

کنور کی ستی کے بعد اٹھنے والے ہنگامے کے نتیجے میں ۴۵ آدمی گرفتار کیے گئے اور ان پر قتل کا الزام لگایا گیا۔کئی ماہ کی عدالتی کارروائی کے بعد سب کو رہا کر دیا گیا۔ بعد میں ایک اور انکوائری کی گئی جس کے نتیجے میں ۱۱ لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ان میں ریاست کے وہ سیاست دان بھی شامل تھے جنہوں نے اس واقعے کو بہت سراہا تھا۔لیکن ۳۱ جنوری ۲۰۰۴ءکو جے پور کی ایک عدالت نے سب کو بے گناہ قرار دے دیا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندو عدالتیں بھی اس جرم میں مددگار نظر آتی ہیں۔

مغربی بنگال کی اس عورت کا واقعہ جسے گاؤں کی کونسل نے جنسی تشدد کا نشانہ بنائے جانے کا حکم صرف اس وجہ سے دیا تھا کہ اس نے ایک غیر قبیلہ کے شخص سے تعلقات استوار کر لیے تھے۔یہ ظاہر کرتا ہے کہ انڈیا میں عورتوں کو کتنی پست سطح پر رکھا جاتا ہے۔کوئی مرد کبھی ایسے ''جرم'' کی وجہ سے سزا کا مستحق نہیں ٹھہرتا۔

افسوس کا مقام ہے کہ بھارت کے کلچر کا یہ پہلو۔ بین الاقوامی طور پر خاطر خواہ توجہ حاصل نہیں کرسکا۔ بھارت کو خاص توجہ دینے والے صحافی بھارت میں عورتوں سے ایسے وحشت ناک سلوک کو دیکھ کر دوسری طرف منہ پھیر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب مغربی ممالک کی سیاح خواتین پر بھی ایسے مجرمانہ حملے کیے جاتے ہیں اور انہیں بے آبرو کیا جاتا ہے تو ان صحافیوں

کی کہانیاں اخباروں کے پہلے صفحوں سے غائب ہوجاتی ہیں۔ بھارت کے ساتھ یہ خاص لحاظ کیوں کیا جاتا ہے؟ کیا کوئی اس بات کا تصور کرسکتا ہے کہ اگر کوئی سفید فام مغربی عورت کسی مسلم اکثریتی ملک میں مجرمانہ حملہ کا ہدف بنے تو اسی مغربی میڈیا کے غصے کا کیا عالم ہوگا؟

(بشکریہ کریسنٹ انٹرنیشنل فروری ۱۴۔ترجمہ: ڈاکٹر مقبول احمد شاہد)

☆☆☆

# نعت

انہیں شامل توکرلوں داستاں میں
یہ مشکل ہے کہاں وہ اورکہاں میں

تکلف برطرف یہ بات سچ ہے
نہیں ہوں نعت کے شایانِ شاں میں

رسائی ان کی ہے عرشِ بریں تک
سیہ بخت ونصیبِ دشمناں میں

ادامیں حق کروں اُنؐ کی ثنا کا
نہیں ہے یہ مرے وہم وگماں میں

متاعِ کن فکاں کے وہ ہیں مالک
کفِ رفتہ متاعِ رائیگاں میں

جہانِ آب وگل کی بات کیا ہے
نہیں اُنؐ کا مقابل دوجہاں میں

ہے اُنؐ کی آمد آمد کا قرینہ
بڑی وارفتگی ہے لامکاں میں

ستارے اُنؐ کے جوزیر قدم تھے
سجائے ہیں کسی نے کہکشاں میں

تڑپ جائیں جسے سن کر مسلماں
اثر اتنا تو ہو میرے بیاں میں

خدامحفوظ رکھے ہر بلا سے
نہیں کوئی محافظ کارواں میں

غلامی اُنؐ کی راس آئی ہے اسرارؔ
بنا ہوں اُنؐ کی مدحت کا نشاں میں

اسراراحمدسہاوری

(''ذوقِ عرفان'' سے انتخاب محمودہ شراونی)

☆☆☆

## غزل

عیش کرنے آ گئے قسمت جگانے آگئے
اس زمین پر ہم مقدر آزمانے آگئے

چھوڑ کر بزم حقیقت کی وہ سادہ زندگی
خواب کے دریاؤں میں ہم غوطے کھانے آگئے

نرم گھاسوں پر چہل قدمی گراں تھی ملک میں
گرم جھونکے ریت کے کھانے کھلانے آگئے

خواب میں جس دن دریچہ تلخیوں کا کھل گیا
دیکھ لو گے دوست سب اپنے ٹھکانے آگئے

کیا اکڑ کر چلتے تھے مستی میں پہلے اے شہودؔ
نشہّ جب ٹوٹا تو غزلیں گنگنانے آگئے

(شہود ہاشمی)

☆☆☆

## مدحتِ مصطفیٰؐ

(تضمین)

خدا کو یاد رکھے مصطفیٰؐ کی راہ پہ چلے
ہر ایک صاحبِ ایمان اس طرح ہی کرے

خدا سے عشق غلامی کا یہ تقاضا ہے
ڈگر پہ پیارے نبیؐ کی جیے اسی پہ مرے

دیا ہے عشق محمدؐ نے سبق یہ ہم کو
ہر ایک حال میں بندہ خدا سے ڈرتا رہے

اسی میں دنیا وعقبےٰ کی کامرانی ہے
نبیؐ کا نام سنے تو ہر اک درود پڑھے

بڑا ہی تشنہ و محروم وکم نصیب ہے وہ
کہ اُنؐ کے فیض سے جو اپنی جھولیاں نہ بھرے

انہیں کا نقش قدم تیری منزلوں کا پتہ
خدا کرے کہ تو غازیؔ اسی پہ چلتا رہے

(غازی بھوپالی)

☆☆☆

# غزل

نقوشِ رونقِ محفل کبھی مدھم نہیں ہوں گے
ہماری یاد تو ہوگی جہاں پر ہم نہیں ہوں گے

اسی کی یاد میں ہر آزمائش کو سہا ہم نے
کسی بھی زخم پر آنکھوں کے گوشے نم نہیں ہوں گے

صلیب ودار کا قصہ پرانا بھی ، نیا بھی ہے
اگر ہم ہیں تو اس قصے کے راوی کم نہیں ہوں گے

ہم اپنے سوزِ دل سے حق کی شمعوں کو جلاتے ہیں
بگڑتا ہے کوئی ہم پر تو ہم برہم نہیں ہوں گے

تمہیں ہم کیا کہیں تم عشق کی لذت کو کیا جانو
یہاں جاں سے گزرنے پر کبھی ماتم نہیں ہوں گے

صفِ باطل کے صیادوں کو یہ پیغام دے دینا
یہ سر کٹ جائیں گے لیکن کبھی بھی خم نہیں ہوں گے

کتابِ زیست کے ہر باب پر یہ نازؔ لکھ دنیا
اگر اک سانس بھی ساقی ہے تو بے دم نہیں ہوں گے

(روبینہ فرید)

☆☆☆

# ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے نام

ہاتھ میں یہ یہ تمہارے جو قرآن ہے
عالمِ کفر اس سے پریشان ہے

بیٹیو، ماؤ بہنو ہمیں فخر ہے
قوم پہ یہ تمہارا اک احسان ہے

لے کے نکلی، کتابِ ہدایت ہو تم
دین بیزار لوگوں میں ہیجان ہے

کامیابی کا زینہ یہی ایک ہے
ہر مسلمان کا اس پہ ایمان ہے

ہے وہ بہتر جو سیکھے، سکھائے اسے
خاتم الانبیا کا یہ فرمان ہے

روکتا ہے تمہیں جو بھی اس کام سے
کیسا بدبخت ایسا مسلمان ہے

کارواں اب ہمارا رکے گا نہیں
ماؤں، بہنوں کا شارقؔ یہ اعلان ہے

(مختار حسین شارقؔ)

# آدھا گلاس

گھر میں سخت ٹینشن اور گھٹن کا ماحول تھا۔ وردہ نے آفت مچائی ہوئی تھی۔ ہر کوئی سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا کہ ضروری نہیں جو تم سمجھ رہی ہو وہ صحیح ہی ہو۔ لیکن مرغ کی ایک ٹانگ کی طرح وہ اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔ بالآخر ناصرہ امی نے اسے قابو کیا۔

''جو بات تم کہہ رہی ہو وہ غلط بھی تو ہوسکتی ہے؟''

وردہ نے کہا ''نہیں تائی امی مجھے سننے میں غلطی ہوسکتی ہے دیکھنے میں نہیں، کیا جو بات میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے وہ جھٹلا دوں؟''

''بعض اوقات بیٹے ہم جو دیکھتے ہیں وہ، وہ نہیں ہوتا جو ہم دیکھ رہے ہوتے ہیں۔''

''لیکن تائی اماں یہ کیسے ممکن ہے؟'' وردہ کا منہ کھلا رہ گیا۔

''اچھا مجھے یہ بتاؤ جب ہم ٹرین میں سفر کررہے ہوتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ باہر گھر، گاڑی ہر چیز تیزی سے بھاگ رہی ہے کیا وہ گھر، کھیت، کھلیان جن کو ہم بھاگتا دیکھتے ہیں ہماری قوت مشاہدہ کو جھٹلاتے ہیں؟؟ حالانکہ بھاگ تو ٹرین رہی ہوتی ہے۔ ہم الٹ دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

وردہ گم سم ناصرہ امی کی شکل دیکھتی رہی۔ ''تائی جان میں نے تو جو دیکھا وہ غلط نہیں ہوسکتا۔ میں ثمرہ سے نوٹس لینے اس کے گھر گئی تو میرے میرے آگے آگے ثمرہ کی امی یعنی مسعودہ آنٹی داخل ہو رہی تھیں بس چند قدم آگے تھیں۔ میں ان کے گیٹ تک پہنچی تو انہوں نے مجھے دیکھنے کے باوجود گیٹ بند کرلیا۔ میں پہلے تو یقین ہی نہیں کر پا رہی تھی پھر جب مجھے یقین آیا تو میں الٹے پاؤں واپس آگئی۔ انسلٹ، بے عزتی تو بہت چھوٹے لفظ ہیں تائی امی اس وقت جو میری حالت تھی اس کو دنیا کی کوئی لغت بیان کرنے سے قاصر ہے۔''

''اچھا خیر چھوڑو۔ اول تو اس کی کوئی وجہ بھی ہوسکتی ہے لیکن پھر بھی تم اصرار کرتی ہو تو صبر جس طرح بیماری یا مصیبت پر کیا جاتا ہے تو معاف کرنا بھی تو غلطی پر ہی ہوتا ہے۔ تم معاف کرو۔ معاف کرنے کی پہلی شرط بھلا دینا ہے۔ اگر ساری زندگی اسے دل میں اور موقع ملنے

پر زبان کی نوک پر رکھا تو یہ معافی کی توہین ہے۔''

تائی امی کا رعب، حلم اور مقام و مرتبہ اس لائق تھا کہ وردہ معاف کرنے کا اعلان کر کے ہی اٹھی۔ جس کے جواب میں تائی امی نے اس کا ماتھا چوما اور اپنی دراز سے کڑکڑاتا ہوا سو کا نوٹ خوشی میں دیا۔

''لو تمہاری وجہ سے میں بھی نیکی کی حقدار بن گئی اس کو تحفہ سمجھو یا شکرانہ ایک ہی بات ہے۔''

ابھی وردہ نے تائی امی کا شکریہ بھی ادا نہیں کیا تھا کہ زور زور سے ہنسنے بولنے کی آواز آئی۔ وردہ اس آواز کو سو نہیں ہزار آوازوں میں بھی آسانی سے پہچان سکتی تھی۔ ثمر اور اس کی امی کی آواز۔ وردہ کے رگ و پے میں غصہ اور انتقامی سوچ بھر گئی۔ تائی امی پر نظر پڑی اور جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ جذبات پر قابو پانے تک منہ دوسری طرف کر لیا۔ ثمر کی امی آنٹی مسعودہ حیرانی سے بولیں ''تم تو سرگودھا نہیں گئی ہوئی تھیں نانو کے پاس......آ گئیں؟؟ ارے یہ وردی کو کیا ہوا ہے؟؟''

وہ پیار سے ہمیشہ وردہ کو وردی کہتی تھیں۔

وردہ منمنائی ''کچھ نہیں آنٹی۔''

''ہائیں کچھ نہیں بھی کہہ رہی ہو اور منہ بھی پھلایا ہوا ہے کیا کسی سے لڑائی ہو گئی ہے یا بھڑ نے کاٹ لیا ہے؟''

وردہ کی آنکھیں اس وقت ایک چھلنی تھیں جن سے دھار و دھار پانی بہنے لگا۔ وہ گھبرائیں۔

''ارے پگلی کیا ہوا؟ کیا کسی سے ڈانٹ پڑ گئی ہے، کوئی بات نہیں بڑوں کا حق ہوتا ہے سمجھانا۔ تم لوگ اسے انسلٹ محسوس کرنے لگ جاتے ہو۔''

تائی امی نے ماحول کو سنبھالا۔ ''نہیں بھئی مسعودہ! بات یہ ہے کہ میری وردہ نہ تو ہماری ڈانٹ ڈپٹ پر برا مناتی ہے نہ ہی لڑائی جھگڑا پسند کرتی ہے یہ بس...... کچھ زیادہ ہی حساس ہے۔ چھوٹی سی بات کو محسوس بہت کرتی ہے۔''

''ہائے تو آج کیا محسوس کر لیا؟'' وہ پیار سے بولیں تائی امی ہچکچائیں۔ ''محسوس کیا کرنا بس کہیں ثمر سے کام تھا گئی تو تم نے اسے دیکھ کر کہیں گیٹ بند کر لیا۔ بس اسی پر رو رو کے آنسوؤں کے دریا بہا رہی ہے۔''

تائی امی نے بالآخر بات گو کہ کڑوی تھی مکمل کر ہی لی۔

''تم......ارے تم کب وہاں گئی تھیں؟'' بغیر برا منائے انہوں نے کہا۔

''جب آپ ہاتھ میں پلاسٹک کی ٹوکری پکڑے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ گرے چادر اوڑھی ہوئی تھی

آپ نے اور سٹائلو کا جوتا تھا سفید رنگ والا۔'' جس کے دل کو ٹھیس لگی تھی اس نے فر فر ساری جزئیات گوش گزار کر دیں۔

''اری میری بچی!'' مسعودہ آنٹی نے اسے سینے سے لگایا فائقہ کے ہاں پہلوٹھی کی بچی پیدا ہوئی ہے۔ ہسپتال سے آ رہی تھی ساری رات وہاں رہی، دماغ ہی کام نہیں کر رہا تھا۔ میں سمجھی شاید مرزا صاحب کے ہاں کوئی اکیڈمی میں پڑھنے والی ہے اور تیز تیز جا رہی ہے۔ دوسرا یہ میرے ذہن میں تھا کہ تم تو سرگودھا ہو لہٰذا ذہن نے اس چیز کو ہلکا پھلکا لیا کہ تم یہاں کیسے ہو سکتی ہو۔'' اب بھی تسلی نہیں ہوئی تو یہ دیکھو صبح سے تمہارے لیے عیدی تیار کر کے رکھی ہے ثمر نے فون کر کر کے ناک میں دم کیے رکھا کہ بھانجی کی پیدائش کی خبر سب سے پہلے وردہ کو سناؤں گی۔''

وردہ شرمندہ شرمندہ سی نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے بغیر مخاطب کیے بس اتنا کہا۔

''بیٹے ہم اصل میں منفی اور مثبت میں پہلے منفی چیزوں کو لیتے ہیں۔ امرود سے کھانسی ہوتی ہے۔ کیلے بلغم پیدا کرتے ہیں، مالٹے گلا خراب کرتے ہیں، گاجریں ٹھنڈی تاثیر رکھتی ہیں۔ میتھی سے گرمی پیدا ہوتی ہے۔ ساتھ یہ نہیں دیکھتے کہ ان کے فوائد اللہ جی نے بے شمار رکھے ہیں ان کا زبان پر ذکر ہی نہیں لاتے۔ اپنے منہ سے مسعودہ آنٹی کی تعریفوں کے پل باندھتے باندھتے ایک غلط فہمی نے ساری خوبیوں پر پانی پھیر دیا اور مسعودہ آنٹی کی سدا بہار شہرت، بدنامی میں بدلنے لگی تھی! ہے ناں؟''

شرمندگی سے سر نیچے کر کے وردہ نے سر ہلایا۔''جی ہاں۔''

لیکن اس جی ہاں میں بڑے سبق تھے صرف اس کے لئے نہیں سب کے لئے اگر کوئی لینا چاہے۔

☆☆☆

فرحی نعیم

# زندگی تیرے کئی روپ

''نہیں، ابو جی، اب نہیں بالکل نہیں۔'' عفت آنسو بہاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''بیٹا!تم میری بات سمجھو۔'' ابو جی کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ عفت کو کیسے سمجھائیں۔

''ابو جی! بس، میری زندگی کھلونا نہیں۔ اب تک جو کچھ ہوا میں نے جھیل لیا، لیکن اب میں پھر، نہیں، ابو جی نہیں، دیکھیں میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔''

''میری بچی تم کیوں نہیں سمجھ رہیں، میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، تمہارے بھائی بھی سب اپنے گھر بار کے، بیوی بچوں والے، بہنیں شادی شدہ، ایسی صورت میں کل کو میں یا تمہاری ماں نہ رہیں تو تمہارا کیا ہوگا؟''

''زندگی کا تو کسی کا بھی بھروسہ نہیں، آپ سے پہلے میں بھی تو جا سکتی ہوں، بس آپ پریشان نہ ہوں اور میری شادی کا خیال نکال دیں۔''

''ایسا نہیں ہوسکتا۔ تم میرے بڑھاپے کو دیکھو، میں تمہارے لیے بہت پریشان ہوں، تمہارا غم ہم میاں بیوی کی راتوں کی نیندیں اڑائے ہوئے ہے۔''

''ابو جی! میں نے امی سے بہت کہا ہے، میں نے صبر کر لیا ہے اب آپ لوگ بھی میری طرف سے فکر مند نہ ہوں، میں یہاں خوش ہوں۔'' عفت کا لہجہ اب بھی بھرایا ہوا تھا۔

''میری بیٹی تم حقیقت کو دیکھو، تم یہاں خوش ہو یہ اچھی بات ہے لیکن تم ہماری مجبوری نہیں سمجھ رہیں۔ منظور احمد اچھے آدمی ہیں مجھے یقین ہے تم ان کے گھر خوش رہو گی۔

بیٹیا بس اب انکار نہ کرو، تمہاری ماں نے بہت تھک ہار کر مجھ سے کہا تھا، اور میں نے اس نیک بخت کو یقین دلایا تھا کہ میں عفت کو راضی کرلوں گا، بس اب میرا مان تم ہی رکھ سکتی ہو، ہماری امید نہ توڑو۔'' ابو جی کے لہجے میں نہ جانے ایسا کیا تھا کہ عفت نہ چاہتے ہوئے بھی سر جھکا گئی۔ اس کا دل اس لمحے نہ جانے کتنے ٹکڑوں میں بٹا تھا لیکن وہ باپ کا مان نہیں توڑ سکتی تھی۔

''جیتی رہو۔'' ابو جی خوشی سے کپکپاتی آواز میں بولے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کمرے

سے باہر نکل گئے۔ باہر جا کر انہوں نے امی کو عفت کے راضی ہونے کی خوشخبری سنائی تھی۔ امی تو یہ سن کر چند لمحے تو حیرت سے میاں کو دیکھتی رہیں پھر جلدی سے ہاتھ سے چھالیہ اور سروتا، پاندان میں رکھ کر اٹھیں اور عفت کے پاس چلی آئیں جہاں عفت سر گھٹنوں میں دیئے سسکیاں بھر رہی تھی۔ امی نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے سینے سے لگالیا۔ عفت کی سسکیاں کچھ اور تیز ہوگئی تھیں اور اب اس کی آنکھوں کے ساتھ امی کی آنکھیں بھی آنسو بہا رہی تھیں۔

☆......☆......☆

''آخر یہ امتحان ختم کیوں نہیں ہو جاتا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں مر جاؤں۔''

آج امی نے اس کے نکاح کا بتایا تھا کہ اگلے مہینے وہ اس کا نکاح کر رہے تھے۔ عفت یہ سن کر پہلے تو چند لمحے ماں کو خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی پھر بولی بھی تو کیا۔

''کیسی باتیں کر رہی ہوں عفت، خدا سے خیر مانگو۔'' امی اس کی بات سن کر ایک دم ہول گئی تھیں۔ ''دیکھنا اس میں تمہارے لیے بہتری ہوگی بھلا ماں باپ اپنے بچوں کا کبھی برا چاہیں گے۔''

''ماں باپ تو کبھی نہیں چاہتے لیکن ہم مقدر تو نہیں بدل سکتے۔ نہ جانے میرے نصیب میں کیا ہے۔ یہاں سے رخصت ہوتی ہوں اور پھر واپس آجاتی ہوں۔'' عفت اپنے اوپر ہنس پڑی۔

''نہ، ایسے نہیں کہتے۔'' امی کے دل میں کچھ ہوا۔

''اور کیا کہوں میری زندگی تو تماشہ بن گئی ہے۔'' عفت نے آنکھیں بند کر لیں، آنسو پھر جمع ہونے لگے۔

''عفت! بس، یہ بھی ایک آزمائش ہے۔ اب تم اللہ سے خیر مانگو۔ اب میں تمہارے منہ سے کوئی الٹی سیدھی بات نہ سنوں۔'' امی غصہ سے کہہ رہی تھیں۔

☆......☆......☆

عفت اپنے والدین کی لاڈلی اولاد تھی۔ وہ چھ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ اس کی شادی بہت کم عمری میں والدین نے ایک مناسب رشتہ دیکھ کر کر دی تھی۔ چند دن تو وہ سسرال میں خوش رہی لیکن جیسے ہی دلہناپے کے دن ختم ہوئے سسرال والوں نے اس پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ دیئے۔ سارا دن وہ کولہو کے بیل کی طرح کام کرتی۔ رہی سہی کسر رات کو میاں آکر پوری کرتا۔ نہ جانے ماں بہن اس کے کس طرح کان بھرتیں کہ وہ جو پہلے ہی کام سے تھکا ہوا اور بدمزا ہوا

ہوتا۔ اسکا شوہر ماں بہن کے بھڑکانے سے بالکل آپے سے باہر ہوجاتا اور غصہ میں عفت پر ہاتھ اٹھاتا۔ وہ ماں کو آکر بتاتی تو وہ بھی اس کے زخموں پر پھائے رکھتیں اور صبر کی تلقین ہی کرتیں کہ یہ تکلیفیں چندروزہ ہیں سہہ لو۔ لیکن ان لوگوں نے تو عفت کو تختہ مشق ہی بنائے رکھا۔ اور ایک دفعہ ایک بہت ہی معمولی بات پر اس کو روئی کی طرح دھنک ڈالا۔ ساتھ ہی عفت کے والدین کو فون کردیا کہ اسے آکر لے جائیں۔ جب عفت کے ماں باپ نے اس کی یہ حالت دیکھی تو بیٹی کو فوراً ہی گھر لے کر آگئے۔ آج عفت نے پہلی دفعہ باپ کے اصرار پر زبان کھولی تھی۔ اور اپنے اوپر کیے گئے ظلم بیان کیے تھے۔ ابو جی نے تو اسی وقت فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اب کسی صورت بھی بیٹی کو اس جہنم میں نہیں بھیجیں گے۔ امی نے اگرچہ چند دن بعد ابو جی کو بیٹی کی حالت کے پیش نظر اسے سسرال بھیجنے پر راضی کرنا چاہا لیکن ابو جی اپنی پھول سی بیٹی کی حالت دیکھ کر قطعی فیصلہ کرچکے تھے۔ مہینے بعد عفت کے سسرال والوں کو بھی ہوش آیا اور انہوں نے عفت کو لانے کے لئے بڑا زور لگایا لیکن ابو جی نے نہ بھیجا اور عفت کی مرضی سے انہوں نے طلاق لے لی۔ عفت تقریباً دس مہینے سسرال رہی تھی لکن یہ تمام عرصہ جیسے زندگی اس پر تنگ ہوگئی تھی۔ اس کی زندگی کا ایک بھیانک دور جیسے ختم ہوا تھا اور وہ پچھلے دور کو ایک خوفناک خواب سمجھ کر بھول جانا چاہتی تھی۔ اس عرصہ میں ایک ننھی سی امید کی کرن بھی جگمگائی تھی لیکن جلد ہی وہ بجھ گئی تھی اس کی قسمت میں اولاد کی خوشی نہ لکھی تھی۔

دو سال گزر چکے تھے، وہ اذیت ناک دور تقریباً بھول چکی تھی۔ ایک دفعہ پھر اس کے رشتے آنے لگے تھے ویسے بھی ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی فقط بائیس سال، اور اتنی سی عمر میں اس نے بڑا تلخ تجربہ حاصل کرلیا تھا۔ امی، ابو جی اس کی دوسری شادی کے سلسلے میں ایک دفعہ پھر سرگرم ہو چکے تھے اگرچہ وہ ان کو انکار کرچکی تھی لیکن والدین نے اس کی بات کو قابل اعتنا نہ سمجھا تھا۔

☆......☆......☆

''امی! میں نے آپ سے کہا تھا، میں شادی نہیں کرونگی، میرے لیے ایک ہی تجربہ بہت ہے۔''

امی نے اس کے آگے جب ایک تصویر رکھی تو پہلے تو وہ سمجھی نہیں اور جب سمجھی تو یوں اچھلی جیسے بستر پر اچانک کانٹے اُگ آئے ہوں۔

''اسے بھول جاؤ عفت۔'' امی نے اسکا ہاتھ

سہلایا تھا۔

''بھول چکی، لیکن آپ پھر مجھے اسی تجربے کی بھینٹ چڑھا رہی ہیں۔''

''خدا نہ کرے میں کیوں تمہیں دوبارہ بھینٹ چڑھاؤں گی۔'' امی دہل کر بولیں۔

''تو پھر مجھے شادی کے لئے نہ کہیں۔'' اس نے ہاتھ جوڑے۔

''عفت میری جان!'' امی نے اسکے جڑے ہوئے ہاتھ اپنے چہرے سے لگائے۔ ''ہر کوئی ایک جیسا نہیں ہوتا۔ ضروری نہیں کہ اس دفعہ بھی وہی ہو جو پہلے ہو چکا ہے۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔''

''اور اگر اس دفعہ بھی وہی ہوا جو پہلے ہو چکا ہے تو پھر آپ کیا کریں گی؟'' اس نے سوال کیا۔

''تم کیوں اتنی قنوطی ہو رہی ہو، کیوں منفی سوچیں تمہارے دماغ میں بیٹھ گئی ہیں۔ تمہارے ابو طاہر میاں کی والدہ اور بہن کو ہاں کہہ چکے ہیں۔'' امی دھیمے سے بولیں۔

''کک، کیا؟ کیا مطلب آپ مجھے اب بتا رہی ہیں جب جب......'' اس سے بات پوری نہ ہوئی۔

''کیونکہ ہم تم کو اپنے گھر میں آباد دیکھنا چاہتے ہیں۔ خوش باش۔'' امی نے اسے مزید بولنے کا موقع نہ دیا اور اسے مستقبل کا حسین اور روشن پہلو دکھاتی رہیں۔

اور وہ زیادہ دیر انکار نہ کر سکی۔ امی اور بہنوں نے اس کی شادی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ وہ بھی جلد ہی بہل گئی۔ چند ماہ کے بعد اس کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی تھی۔ درزی، بازار، جیولرز وہ پچھلی تلخی بھول کر ایک بار پھر زندگی کی خوشیاں کشید نے چلی تھی۔ اور امی کی خوش امیدیاں کچھ ایسی غلط بھی نہ تھیں۔ طاہر واقعی ایک اچھے شوہر ثابت ہوئے تھے۔ اس کے سارے ڈر خوف انہوں نے اپنی محبت سے دور کر دیئے تھے۔ وہ سچ مچ طاہر کے ساتھ خوش تھی۔ شادی شدہ زندگی کا لطف اب اٹھا رہی تھی۔ ماضی کیسا تھا طاہر نے اسے بھلا دیا تھا۔ طاہر اگرچہ اس سے عمر میں خاصے بڑے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ان کے ساتھ ایک خوش وخرم زندگی گزار رہی تھی۔ اور یونہی چار سال گزر گئے تھے۔ طاہر کا رویہ اس کے ستاھ پہلے دن جیسا ہی تھا۔ لیکن اب اسے اپنے گھر میں ایک بہت بڑی کمی دکھائی دیتی اور وہ اس چہکار کی تھی جس سے اس کا آنگن اب تک محروم تھا۔ کتنے ہی ڈاکٹرز کو وہ دکھا چکی تھی لیکن خدا کی مرضی کے آگے سب بے بس تھے۔ وہ طاہر کے

آ گے بھی اس کمی کا اظہار کرتی تو وہ اس کی بات ہنسی میں اڑا دیتے۔

''ارے بھئی جب ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے کافی ہیں تو پھر تیسرے کی کیا ضرورت ہے؟'' وہ ہنستے۔

''ضرورت ہے طاہر، بہت ضرورت ہے۔'' وہ زیرلب کہتی۔

اور اسی طرح طاہر کے ساتھ زندگی بڑی مطمئن گزر رہی تھی کہ ایک رات اچانک ہی طاہر کی طبیعت بگڑی۔'' پچھلے کئی دنوں سے ان کا بلڈ پریشر ہائی رہ رہا تھا اور وہ علاج کے معاملے میں بڑی کوتاہی برت رہے تھے۔ طاہر کی طبیعت بگڑتے ہی اس نے اپنے گھر اور سسرال فون کیا۔ پڑوسی کی مدد سے وہ فوراً ہی ان کو ہسپتال لے گئی تھی۔ طاہر کو ایمرجنسی میں لے جایا گیا تھا۔ لیکن شاید دیر ہوگئی تھی کہ ان کا وقت ہی آ گیا تھا۔ دل کا پہلا دورہ جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ اور طاہر اسے یوں اچانک ہی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ پندرہ سال اس نے طاہر کے ساتھ خوشیوں سے بھرے گزارے تھے کہ اچانک ہی اس کی خوشیوں کو نظر لگ گئی تھی۔ طاہر کی موت کا سن کر اسے تو سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ بڑی مشکلوں سے وہ سکتے سے باہر آئی تھی۔ اور پھر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی کہ اسے سنبھالنا مشکل ہوگیا تھا۔

اس کے لئے تو طاہر کے بغیر جینے کا تصور سوہان روح تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے اوپر اتنی سخت آزمائش بھی آئے گی۔ وہ کیسے جیے گی، جی بھی سکے گی یا نہیں۔ لیکن یہ سب اس کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ وہ زندہ تھی، مری نہیں تھی لیکن اس کا دل مر گیا تھا۔ وہ ایک زندہ لاش بن گئی تھی۔ اور ایک بار پھر اپنے والدین کے گھر آ گئی تھی۔ امی، ابو جی، بہن، بھائی سب اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتے اور آہستہ آہستہ وہ پھر زندگی کی طرف آ گئی تھی۔ تقریباً ایک سال گزر گیا تھا طاہر کی موت کو، اب پھر اس کی شادی کرنا چاہتے تھے لیکن اس نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر ان کو اس سے باز رکھنے کی درخواست کی تھی لیکن کسی نے اس کی بات پر توجہ نہ دی۔ ابو جی بالا ہی بالا اپنی کوششوں میں لگے رہے اور آخر کار ان کے ملنے والوں میں سے ایک صاحب کی طرف سے دیا ہوا پیغام ابو جی نے منظور کر کے گھر میں بتا دیا تھا۔ امی نے جب عفت سے اس سلسلے میں بات کی تو وہ تو بالکل ہتھے سے اکھڑ گئی تھی وہ کسی صورت اب شادی پر راضی نہ تھی، امی، بہنیں،

جب اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے تب امی نے ابو جی سے کہہ کر اسے شادی پر راضی کروایا تھا۔اور عفت باپ کو چاہتے ہوئے بھی قائل نہ کر سکی۔اور ان کی مرضی کے آگے سر جھکا کر رہ گئی۔

نکاح بہت سادگی سے ہوا صرف گھر کے بھائی، بہن دوسری طرف منظور احمد کے ایک دوست اور بھائی بہن تھے۔گنتی کے پانچ افراد اسے رخصت کروانے آئے تھے سادے سے کھانے کے بعد عفت، منظور احمد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگئی۔ اس کے احساسات مردہ ہو چکے تھے اور اسے اس سے اپنا آپ ایک زندہ لاش کی مانند لگ رہا تھا۔منظور احمد، جوان بچوں کے باپ تھے کئی سال پہلے ان کی رفیقہ حیات کا انتقال ہوچکا تھا۔ چار بچے تھے، دو بیٹے اور دو بیٹیاں، ایک بیٹا بیٹی کی شادی کر چکے تھے۔ بڑھتی عمر انہیں ایک دفعہ پھر ایک ساتھی کی ضرورت کا احساس دلا رہی تھی۔پھر قریبی عزیز بھی انہیں نکاح کا مشورہ دے رہے تھے۔ عفت کے والد سے منظور احمد کے پچھلے چند سالوں سے دعا سلام تھی جب ان کو ان کی بیٹی کے حالات کا علم ہوا تو منظور احمد نے کافی سوچ بچار کے بعد اپنے آپ کو پیش کر دیا۔عفت کے والد بھی، منظور احمد کی شرافت کے گواہ تھے لہٰذا انہوں نے اس رشتے کو قبول کرنے میں دیر نہ لگائی۔

یوں عفت تیسری بار گھر بسا رہی تھی۔منظور احمد ایک عام سے مرد تھے۔انہیں گھر اور اپنے بچوں کے لئے ایک خاتون کی ضرورت تھی جو احسن طریقے سے ان کا اور ان کے گھر کا خیال رکھ سکے اور بہت جلد عفت نے اپنی یہ ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ زندگی کی گاڑی چل رہی تھی کہ اس میں ایک بہت حیرت انگیز موڑ آیا، اتنا حیرت انگیز اور ناقابل یقین کہ عفت دنگ رہ گئی۔

وہ روز کی طرح اپنے کام انجام دے رہی تھی مگر کام کے دوران کافی کمزوری محسوس کر رہی تھی۔طبیعت کچھ گری گری تھی۔اس نے منظور احمد سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے اسے ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دیا اور وہ جواب میں سر ہلا کر رہ گئی۔

تین چار دن اس نے اسی طرح نکال دیئے۔آج وہ ماں سے ملنے آئی ہوئی تھی۔کھانا کھانے بیٹھی اور دو لقمے کھا کر ہی ہاتھ روک لیا۔

''ارے کیا ہوا عفت؟ کھانا کھاؤ نا، رک کیوں گئیں؟'' امی پوچھ رہی تھیں۔

''بس امی !جی نہیں چاہ رہا۔'' بھوک نہیں لگ

رہی۔‘‘

امی تو پریشان ہی ہوگئیں، پے در پے کئی سوال کرڈالے۔

’’اوہ امی ایسی کوئی بات نہیں گھر میں سب خیریت ہے، میرے خیال سے مجھے تھکن ہوگئی ہے اوراسی سبب بھوک بھی بند ہوگئی ہے۔‘‘ عفت دھیمے سے مسکرائی۔

ماں اسے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ ڈاکٹر نے معمول کے سوال کیے، چند ٹیسٹ لکھے اور پھر جو کچھ اس نے کہا، عفت کو تو ایسا لگا کہ جیسے ہسپتال کی چھت اس پر گرگئی ہے۔

’’یہ وٹامن اور آئرن لیں، خون کی کمی لگتی ہے، کیونکہ پہلا بچہ ہے لہٰذا ایسی کیفیت کچھ عرصہ تک رہے گی۔‘‘ وہ روانی سے بولی۔

’’کک کیا کہہ رہی ہیں ڈاکٹر صاحبہ! پہلا بچہ کس کا؟‘‘ عفت آنکھیں پھاڑے پوچھ رہی تھی۔

’’ارے آپ کا، خیر سے آپ ماں بننے والی ہیں نا۔‘‘ ڈاکٹر مسکرائی۔

آخر یہ کوئی ناممکن بات تو نہیں۔ بہت عرصے بعد آپ کو خوشخبری ملی ہے نا شاید اس لیے آپ لوگوں کو یقین نہیں آرہا۔‘‘

جواب میں عفت خاموش ہی رہی اسے تو سچ مچ یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ واقعی ماں بننے والی ہے؟ خدا اس پر مہربان ہوگیا ہے؟ ناممکن ممکن ہو رہا ہے؟ وہ ایک سحر زدہ سی کیفیت میں تھی وہ آہستہ سے کھڑی ہوئی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کمرے سے باہر آگئی۔ پھر دونوں خاموشی سے گھر آگئیں۔

عفت خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔ اس کے دماغ میں اس کی ساری زندگی ایک فلم کی طرح چل رہی تھی۔ وہ اس ناقابل یقین صورتحال کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

’’میری بیٹی! دیکھو اللہ تم کو کتنے بڑے انعام سے نواز رہا ہے۔‘‘ امی نے اسے ساتھ لپٹا لیا، خوشی کے مارے ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ جواب میں عفت بھی بے آواز آنسو بہانے لگی۔ یہ واقعی گھر بھر کے لئے ایک حیرت انگیز اور غیر متوقع خوشی تھی۔ جو بھی سن رہا تھا گویا پھولے نہیں سما رہا تھا۔ عفت خود اللہ کے آگے سربسجود تھی۔ اسے کچھ فطرتاً ہی بچے بہت اچھے لگتے تھے۔ اپنے بھانجا، بھانجی، بھتیجے، بھتیجیوں سے اسے بڑی محبت تھی وہ ہر وقت ان کے لاڈ اٹھاتی، فرمائشیں پوری کرتی۔ وہ گھر کے سب بچوں کی چہیتی خالہ اور پسندیدہ

پھوپھو تھی۔ جب اس کی اپنی شادی ہوئی تو سب نے یہی کہا تھا کہ نہ جانے عفت تو اپنے بچوں کو کتنا پھولوں میں رکھے گی۔لیکن اس کی قسمت، پہلی شادی ہی ناکام رہی۔ طاہر کے ساتھ دوسری شادی نے اگرچہ اس کو خوشیوں کی برسات میں بھگو دیا تھا لیکن اولاد کی تڑپ نے اسے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔جیسی تڑپ اولاد کی اسے تھی۔طاہر کو اس کی نصف بھی نہ تھی جس پر وہ طاہر سے خوب حیرانی سے پوچھتی مگر مختلف طریقوں سے اسے مطمئن کر دیتے۔ نہ جانے وہ مطمئن ہوئی تھی یا نہیں لیکن اس کے بعد اس نے دل کو سمجھا لیا تھا۔اگرچہ دعا وہ اب بھی کرتی اور پھر یہ باب طاہر کی موت کے ساتھ بند ہو گیا تھا۔ طاہر کی موت پر وہ بہت تڑپی تھی۔ وہ تو بقیہ زندگی اس کی یادوں کے سہارے گزار دینا چاہتی تھی لیکن والدین کے پُر زور اصرار پر ایک دفعہ پھر پسپا ہو گئی تھی۔امی، ابو جی ہر وقت مصلحت کا کلمہ پڑھتے تھے اور وہ سوچتی کہ اس تیسری دفعہ گھر بسانے میں مصلحت سے زیادہ جگ ہنسائی ہو گی۔لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا، اللہ نے اسے زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے ہمکنار کرنا تھا۔ابھی اس خوشی کو دنیا میں آنے میں چند مہینے تھے کہ ابو جی دنیا سے منہ موڑ گئے۔ وہ پھر بلک بلک کر روئی، ابو جی جانے سے پہلے اس کو مضبوط چار دیواری کا تحفہ دے گئے تھے۔ وہ واقعی ان کی احسان مند تھی کہ وہ بھائیوں کے آسرے پر نہ تھی، یہ بعد میں وقت نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔

''زندگی اتنی خوبصورت بھی ہو سکتی ہے۔'' نرس نے ایک ننھا سا گل گوتھنا اسے تھمایا تو بے اختیار بچے کو اس نے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے سوچا۔

منظور احمد نے اسے اولاد جیسی انمول ہستی سے نواز دیا تھا جس کے لئے وہ اللہ کے بعد ان کی بے حد شکر گزار تھی۔

وہ گل گوتھنا اب اسکول جانے کے قابل ہو چکا تھا۔ بیٹے کی پیاری پیاری باتیں اسے سارا دن مشغول کیے رہتیں۔اس کے ننھے منے کاموں میں دن گزر جاتا، اسکول سے آنے کے بعد عفت نے بیٹے کو گود میں لے کر کھانا کھلایا اب نہلا دھلا کر وہ اسے سلا چکی تھی۔اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ اس کے معصوم چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

اس بچے کے لئے اس نے کہاں کہاں دعائیں نہ کی تھیں اور دعا قبول بھی ہوئی تو کب؟ جب طاہر نہ تھے۔ کیا تھا اگر اس حقیقت پر پردہ ہی پڑا رہتا کتنا

بڑا راز فاش ہوا تھا، اس ننھے کی پیدائش کے بعد، یہ سچائی تو کبھی اس پر بھی آشکار نہ ہوئی تھی جسے بڑا سینت سینت کر رکھا گیا تھا۔ اگر اسے یہ سب معلوم ہوتا تو وہ شاید منظور احمد سے بخوشی نکاح کرتی۔ اس قدر ناامید نہ ہوتی۔ چونکہ خدا نے اسے اولاد کی نعمت سے نوازنا تھا لہٰذا اس کی مخالفت کے باوجود یہ معجزہ بھی ہونا تھا۔ ہم زندگی میں جیسا چاہتے ہیں ہمیشہ ویسا نہیں ہوتا۔ اس بات کو عفت نے بھی قبول کر لیا تھا۔ تب عفت نے اپنے لب آسودگی سے اس کی ننھی سی پیشانی پر رکھ دیئے۔

☆☆☆

صبیحہ نبوت

# خواہش

جب سردیوں کی لمبی اندھیری اور برفانی رات ہو یا بادلوں کی گرج چمک ہو، نیند کا دور دور تک پتہ نہ ہو جبکہ ساری دنیا خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہی ہوتو دماغ میں ہونے والی پہلی دستک ہی انسان کو چونکا دیتی ہے وہ آہستہ سے دروازے کے پٹ کھولتا ہے تو یادوں کے ہجوم غول درغول اندر آنے لگتے ہیں بغیر کسی روک ٹوک کے۔ آج اس ہجوم میں ایک شناسا چہرہ ان کے سامنے تھا۔

یہ کون ہے؟ انہوں نے غور سے دیکھا، کیا گڈو؟ کیا مانی؟ بچے کو پہنچاننے کے لئے وہ اٹھ کر بیٹھیں۔ وہ تو سو رہا تھا لیکن یہ کون ہے؟ اسی شش و پنج میں تھیں لیکن جو بھی تھا پیارا تھا بچے کو انھوں نے پیار کیا، ماتھے پر بکھرے ہوئے بال سنوارے، تکیے کو ٹھیک کیا، رضائی کے دونوں کونے نیچے کی طرف دبائے مبادا ہوا نہ لگے۔ رات بھر اسے اٹھ اٹھ کر دیکھتیں کہیں کھل نہ جائے، کہیں گر نہ جائے۔ پھر وہ تھوڑا سا بڑا ہوا، اس کا چلنا، اس کا بولنا، اس کا سونا، اس کا کھانا اور پھر پڑھنا لکھنا غرضیکہ زندگی اس کے گرد گھوم رہی تھی ایک فلم سی نظروں میں گھوم گئی، انہوں نے پلکیں جھپکائیں یہ میرا گڈو ہی ہے وہی تو ہے وہی چہرہ، پھر خیالات گڈو کے گرد گھومنے لگے۔

دو سال کی عمر سے گڈو نے بولنا سیکھ لیا تھا۔ دنیا جہاں کی نعمتیں، کہانیاں، کلمے، دعائیں، ہر وہ بات جو وہ سنتا سیکھ لیتا، سب کو سناتا بھی، لوگ خوش ہوتے اس کی ذہانت کی داد دیتے۔ بس یہی ماں کے لئے کافی تھا۔ ذرا بڑا ہوا دینی تعلیم کا شعور بھی اجاگر ہوا۔ پھر وہ اسکول جانے لگا اب اسے اور بھی ہر بات کی سمجھ آنے لگی تھی۔ چیزوں کا جگہ پر رکھنا۔ کھانے کے آداب، بڑوں کا ادب، والدین کی اطاعت، جھوٹ اور سچ کا فرق غرضیکہ ہر بات اس کے ذہن نشین ہوگئی تھی۔ یہی تو وہ عمر ہوتی ہے جب بچے کی شخصیت پر تربیت کا پورا پورا کنٹرول ہوتا ہے۔ جس کے لئے ماں نے دن رات ایک کر دیئے تھے۔

پھر وہ اور بڑا ہوا، تعلیم کے ساتھ دوسرے مسائل

میں بھی اضافہ ہوتا گیا،ایک دن اسکول سے شکایت آئی تو ماں کی پریشانی بڑھ گئی۔

ماں نے گڈو سے پوچھا ''ٹیچر نے لکھا ہے تم پڑھائی میں دلچسپی نہیں لیتے۔کلاس میں باتیں کرتے ہو اور اسکول کا کام اکثر نہیں کرتے۔کیا یہ ٹھیک ہے؟''

گڈو نے شرمندہ ہو کر کہا ''امی! یہ ٹیچر مجھے اچھا نہیں لگتا کیونکہ وہ سب کو ڈانٹتا اور مارتا ہے؟''

''تو بیٹا! جب تم کام میں دل نہیں لگاؤ گے تو وہ مارے گا اور ڈانٹے گا بھی۔'' ماں نے گڈو کو سمجھایا۔اور پھر اس کے اوپر مزید نظر سخت کر دی۔لیکن ماں نے محسوس کیا کہ گڈو کا رجحان کرکٹ کی طرف زیادہ ہے۔گیند ہر وقت ہاتھ میں ہوتی ہے اور جب بھی بات کرتا ہے وہ کرکٹ کی یا کھلاڑی کی ہوتی ہے۔ خبریں بھی کرکٹ کی سنتا ہے۔میچ ہو تو سارا دن اسی کی نظر ہو جاتا ہے۔ماں نے ایک دن پریشان ہو کر گڈو سے کہا ''یہ گیند کیوں ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے ہو؟ اپنی پڑھائی پر زیادہ دھیان دو بہ نسبت اس گیند اور کرکٹ کے میچ کے۔''

گڈو نے ہنس کر کہا ''امی! میں کرکٹر بننا چاہتا ہوں۔''

ماں کو دھچکا لگا۔''یہ کیا کہہ رہے ہو۔پڑھائی پر پہلے دھیان دو۔''

''امی! دیکھیں، جاوید میانداد صرف میٹرک ہے لیکن کتنا مشہور ہے۔'' گڈو نے امی کی بات کاٹی اور خوش ہو کر امی کو ہم نوا بنانا چاہا۔

''نہیں بیٹا! ہم نے تو تمہیں ڈاکٹر بنانا ہے......میرا علاج تم ہی تو کرو گے۔''

''اُف امی ڈاکٹر بننے میں تو بہت وقت لگتا ہے اور بہت پڑھنا پڑتا ہے۔''

''تو کیا ہوا بیٹا! یہ باعزت تعلیم اور پیشہ ہے پھر ہماری خواہش بھی ہے۔کیا تم میری خواہش پوری کرنا نہیں چاہتے؟''

''یہ بات نہیں امی! دیکھیں میاں داد کتنا مشہور ہے اور پیسہ بھی ہے پھر ساری دنیا اس کے ہی گن گاتی ہے کیا وہ برا ہے؟ بتائیں ذرا۔''

پھر ماں نے گڈو کو بہت سمجھایا، دعائیں بھی بہت کیں لیکن گڈو دل و دماغ میں کرکٹ اور میاں داد بسا ہوا تھا۔

''بس امی میں تو کرکٹر ہی بنوں گا۔'' یہ سن کر ماں کا سر چکرا گیا۔وہ خاموش ہو گئیں اور دل میں کہتی رہیں

جو کرو گے اپنے لیے کرو گے ہم تو تمہیں سمجھا ہی سکتے ہیں۔ وہ خود ہی بولتی رہیں اور گڈو گیند گھماتا ہوا باہر نکل گیا۔

پھر کبھی کبھی وہ اکثر اس کو سمجھانے کی کوشش کرتیں اور کہتیں کہ تم بچپن میں کتنے اچھے تھے، میری ہر بات مانتے تھے لیکن اب تم میری ہر بات بھول گئے ہو۔ تم بالکل بدل گئے ہو گڈو۔ اب صرف میاں داد تمہاری زندگی پر چھایا ہوا ہے۔

''تو امی! میاں داد میں کونسی برائی ہے؟''

''بیٹا انسان کے لئے تعلیم ضروری ہے تم یہ بات سمجھتے کیوں نہیں ہو؟ میرے ساتھ تمہارا رویہ بھی بدل گیا ہے۔ منع کرنے کے باوجود باہر رہنا چاہتے ہو۔ کھانے پر تمہارا انتظار کرتی رہتی ہوں اور تم نہیں آتے۔'' یہ سب کہتے ہوئے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں ان کو ایسا لگا جیسے تقدیر کے آگے تدبیر بے بس ہے۔

گڈو نے ماں کے قریب آ کر کہا ''اف اللہ امی آپ تو یونہی جذباتی ہو رہی ہیں۔ بس یہ بتا دیں کہ میاں داد میں برائی کیا ہے؟ یہ سن کر انہوں نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے رسید کیا پھر گڈو تو باہر نکل گیا لیکن وہ اپنا ہاتھ تھامے دیر تک روتی رہیں یہ میں نے کیا کیا......؟ دل مایوسی کی گہرائی میں ڈوبنے لگا کیا سوچا تھا کیا ہو گیا۔ میں نے تو اس کی تربیت میں کوتاہی نہیں برتی تھی۔ دینی تعلیم بھی تھی، اچھی تربیت کی، اپنے آپ کو بھول کر ہر لمحہ اس پر صرف کیا، زندگی کے طور طریقے سکھائے، زمانے کی اونچ نیچ سے آگاہ کیا، انسانیت کا سبق دیا۔ پھر کیا کمی رہ گئی، کیا خراب ماحول اور بگڑا ہو معاشرہ اس پر حاوی ہو گیا۔ لیکن کیوں جب بچے کو ہر طرح کی اونچ نیچ کی سمجھ ہو تو دوسری چیزیں کیسے اثر انداز ہوتی ہیں۔ کس بات کی کمی رہ گئی۔ بے شمار خیالات رات کی تاریکی میں گھرے ہوتے رہے۔ مایوسی کی لہر زندگی کے نرم گوشوں میں یوں سرایت کرتی رہی جیسے کوئی مہلک بیماری ہو، جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرا ہو، اعصاب شکن لمحات کا بسیرا ہو، لیکن اب کیا ہو سکتا ہے، بچے بڑے ہو کر کیا یوں ہی بدل جاتے ہیں؟ یہ سوال ہر لمحہ کریدتا رہا۔ اس کے ساتھ وقت کا پہیہ بھی گھومتا رہا، نظریں اس کے تھمنے کا انتظار کرتی رہیں لیکن وقت کا پہیہ نہ تھما۔

ماں باپ بچوں سے یونہی امیدیں باندھ لیتے ہیں پھر وہ امیدیں ایک ایک کر کے وقت کے پہیے میں اٹکتی

رہتی ہیں۔ ایسے جیسے ادھورے خواب ،ٹوٹتے تارے،ٹمٹماتے چراغ۔اس وقت یہ خواہش ہوتی ہے کہ کاش کوئی ان ہونی ہوجائے، وقت کا پہیہ اچانک تھم جائے یا کوئی الہ دین اپنا چراغ دے جائے لیکن جب اولاد آزمائش بھی ہوتو کیسے کوئی ان ہونی ہوگی اورکوئی الہ دین چراغ لائے گااور وقت کا پہیہ کیوں کر تھمے گا......؟

اسی لیے کچھ بھی نہ ہوا، گڈو نے جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیاملازمت بھی مل گئی ماں نے شادی کر کے الگ گھر بھی لے کر دے دیا کہ اپنی مرضی سے زندگی گزارے لیکن ان کے پاس اب گڈو کا بیٹا مانی رہتا تھا۔ جوان کی زندگی کا محور تھااورانہوں نے سوچا تھا وہ اسے کچھ بھی نہیں سکھائیں گی اور ہوا بھی یہی وہ خود ہی سب کچھ سیکھتا رہا۔ وہ سب کچھ دیکھ کر ہی سیکھ رہا تھا۔ دادی اس کے لئے آئیڈیل تھیں۔ ان کی عبادت، ان کی ریاضت، ان کی محبت ہی بس کافی تھی، اب وہ صرف اس سے محبت کرتی تھیں کیا کھایا، کہاں گیا، کب سویا، سردی ہےتو فکر، گرمی ہےتو اس کا مداوا۔ سوجاتا تو اٹھ اٹھ کر دیکھتیں کہیں کھل نہ جائے۔ کہیں گر نہ جائے یوں دونوں کی زندگی بڑی اچھی گزر رہی تھی کہ ایک دن دادی نے مانی سے پوچھا''مانی بڑے ہوکر کیا بننا چاہتے ہو؟''

''دادی میں تو ڈاکٹر بنوں گا۔''

''واقعی۔''انہوں نے حیران ہوکر پوچھا اور خوشی سے چہرہ تمتما اٹھا، کاش کہ میں تمہارے ڈاکٹر بننے تک زندہ رہتی۔ یہ انہوں نے دل میں سوچا۔ اسکے لئے دعا کی۔ مانی نے دادی کو خاموش دیکھا تو فکر مند ہوا۔

''کیا ہوا دادی؟ کیا آپ خوش نہیں ہوئیں۔''

''نہیں بیٹا! کچھ نہیں، مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تمہاری سوچ وہی ہے جو میں نے سوچا تھا لیکن اس وقت پتہ نہیں میں کہاں ہوں گی۔''

''دادی جان آپ یہیں ہوں گی میرے پاس۔ میں اسی لیے تو ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں کہ آپ کا علاج بھی کروں اور خدمت بھی۔'' دادی اس کی معصومیت پر مسکرائیں۔ پھر سے اس کا ماتھا چوما۔اورسوچا اب اسے مزید کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آخری گھڑی کا بھی اسے خود پتہ چل جائے گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔لیکن اس کی باتوں سے ان کے اندر زندگی کی لہر دوڑنے لگی۔ پھراس بات پرایمان اور بھی پختہ ہوگیا کہ دعائیں قبول ضرور ہوتی ہیں خواہ دیر سے ہی ہوں۔

☆☆☆

جہاں آرا مظفر

# گوشۂ عافیت کی کہانی ^[1]

ضلع دادو صوبہ سندھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں کی ایک چھوٹی سی کٹیا میں پیدا ہونے والی بچی نے کتنی محبت پائی، کتنی چاہت لی، ماں باپ کے پاس تو جہالت اور غربت کے ساتھ پانچ بچے پہلے ہی موجود تھے۔ اس کو دنیا میں آنا تھا سو آ گئی۔ کسی چاہت کے بغیر! محبت، چاہت، لاڈ پیار یہ سب کچھ تو وہ جذبے ہیں جو آسودگی اور ذہنی بالیدگی سے پروان چڑھتے ہیں۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں تھا بس ایک احساس تھا بھوک کا، جو پیٹ کی بھی تھی اور نفس کی بھی اور بس۔

باپ کو تو کچھ کرتے کبھی پایا نہ گیا۔ ماں بے چاری گھر کے کام کاج کے ساتھ اُپلے تھوپتی۔ دو پہر کو رلی بناتی۔ ہر دوسرے تیسرے دن اُپلوں کا ٹوکرا سر پر رکھ کر نکڑ پر بنے چائے کے کھوکھے پر دے آتی اور مٹھی میں تھوڑے سے پیسے دبا کر آ جاتی۔ اگر اتنے پیسے ہوتے کہ گڑ چائے اور کلو دو کلو آٹا آ جائے تو لیتی ہوئی آتی۔ ہفتے پندرہ دن میں جب رلی تیار ہو جاتی تو دکان دار سو برائیاں نکال کر تھوڑے پیسوں میں لے جاتا۔ چھوٹی سی آنگنیہ میں دو بکریاں پلی تھیں جن کے دودھ سے چائے بنتی۔ یہ واحد عیاشی تھی اس خاندان کی۔ بچا ہوا دودھ بک جاتا اور اتنے تھوڑے پیسوں سے گھر چل رہا تھا۔

وقت کا کام گزرنا ہے سو گزرتا رہا۔ کہیں تیزی سے اور کہیں آہستہ آہستہ اور وہ ننھی بچی جس کا نام رشیدہ رکھا گیا تھا۔ بہن بھائیوں کے ساتھ پلتی بڑھتی رہی۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے بہت سے کام کر لیتی۔ اس کے بعد آنے والے بہن بھائیوں کی دیکھ بھال اس کی ذمہ داری تھی۔

گھنی گھنی پلکوں میں چھپی سیاہ چمکیلی بڑی بڑی آنکھیں گھنے سیاہ بال، سنہری رنگت۔ چودہ سال کی رشیدہ بی بی پر ٹوٹ کر جوبن آیا۔ روپ تو سب پر آتا ہے۔ یہ عمر ہی ایسی ہے۔ اور پھر رشیدہ کے لئے ایک نکھٹو کا رشتہ آ گیا۔ بالکل اس کے باپ کی طرح۔ وٹہ سٹہ، ماموں کی شادی کرنی تھی لہٰذا رشیدہ کی قربانی دینی پڑی۔ کیسی شادی تھی رشیدہ کو تو یاد بھی نہیں۔ نہ

جوڑا، نہ مہندی، نہ چوڑی، نہ چپل۔ چوٹی ٹیکہ ہار پھول زیور گہنے تو بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں۔

اسی پاکستان میں اسی سندھ میں کروڑوں کی شادیاں ہوتی ہیں۔ ابھی بہت عرصہ نہیں گزرا سندھ کے ایک وزیر کے بیٹے کی شادی تھی۔ کیا دولت کی ریل پیل تھی۔ لگتا تھا کہکشاں رنگ و نور سے آراستہ مہمانوں کا استقبال کرر ہی ہو۔ سات دن تک روز آبادی کی سڑکیں دھلیں اور گلاب پاشی ہوئی۔ ملک میں بجلی کی کمی ہے۔ بارہ گھنٹے اور سولہ گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ ہو رہی ہے۔ لیکن شادی میں لاکھوں قمقمے دن رات جگ مگ کرتے اور علاقہ کو بقعہ نور بناتے رہے۔ زیور گہنہ، ڈیزائینر ڈریس جو یقیناً لاکھوں روپوں کے ہوتے ہیں۔ قیمتی خوشبوؤں کی مہک اور پھولوں کی بہار سے پنڈال مہک رہا تھا۔ روایتی، خاندانی اور موجودہ دور کے بہترین کھانے، شیف اسی وقت تیار کر رہے تھے۔ میزوں پر مینو کارڈ رکھا تھا، جو دل چاہے آڈر کیجیے۔ اور پھر تصویروں کے ساتھ کئی دنوں تک اخباروں میں شادی کے چرچے رہے۔

پاکستان کی سب سے مہنگی شادی تھی یہ...... اسی بستی کے وزیر تھے۔ غریب جاہل اور مفلوک الحال بستی جہاں بچے اسکول نہیں جاتے۔ ہسپتال نہیں، ٹرانسپورٹ کا کوئی نظام نہیں، آبادی کیلئے بجلی پانی گیس کا انتظام نہیں، ملازمتیں نہیں۔ بڑے ایوانوں میں بیٹھے بڑی بڑی باتیں کرکے ہمارے وزیر۔ انہی غریبوں کا حق مار کر خون چوس کر اسمبلیوں میں پہنچے ہیں۔ یہ زمین، یہ لوگ، یہ آسائشیں تو سب باپ دادا کی دی ہوئی ہیں۔ اور شاید یہ بے حسی، بے رحمی اور ظلم بھی۔ اور یہ ظلم اور جبر کا سلسلہ دراز تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

رشیدہ بیاہ کر ایک اور چھوٹی کٹیا میں چلی گئی۔ سسرال میں محبت، چاہت، ناز نخرے کچھ بھی نہ تھا۔ وہی کام جو اس کی ماں کرتی تھی سسرال میں اس کی ذمہ داری بن گئے۔ اُپلے تھوپنا اور رلی بنانا۔

پانچ سالوں میں پانچ بچوں کا اضافہ ہوگیا۔ وسائل نہ ہونے کی وجہ سے مسائل بڑھ گئے۔ بچوں کے لئے نہ غذا نہ دوا۔ تعلیم لباس اور دوسری ضروریات کیسے اور کیونکر پوری ہوں۔ رشیدہ کا میاں تو کچھ کرتا نہ تھا۔ اگر فاقوں پر نوبت آجاتی تو اینٹوں کے بھٹے پر چلا جاتا۔ کبھی کبھار مزدوری مل جاتی تو کچھ کما لاتا۔ بے شک پورا کرنے والا تو اللہ ہے۔ وہ خالقِ کائنات تھوڑے رزق میں برکت ڈالتا رہا اور بچے پروان

چڑھتے رہے۔ بچوں کو تو بڑھنا ہے کہ یہ قانونِ فطرت ہے۔ لیکن نہ تمیز، نہ تہذیب، نہ تعلیم، نہ تربیت۔ یہ علم بھی نہیں کہ کس نے پیدا کیا اور کیوں پیدا کیا۔ کلمہ، نماز، قرآن، ماں باپ کو کچھ نہیں معلوم بچے کہاں سے سیکھتے۔ مسلمان گھر میں پیدا ہوئے مسلمانوں کا نام رکھا لہٰذا مسلمان کہنے کے مستحق ہو گئے۔

اور پھر اس خاندان پر ایک افتاد اور آن پڑی۔ رشیدہ نکڑ کے کھو کھے سے آ رہی تھی کہ راستے میں چچازاد بھائی مل گیا۔ اس سے باتیں کرنے لگی۔ برادری کے کسی شخص نے دیکھ لیا۔ میاں سے شکایت کی۔ اس نے کہا ایسی کوئی بات نہیں رشیدہ شریف ہے، پاکدامن ہے اور بے گناہ ہے لیکن پنچایت نے رشیدہ اور اس کے شوہر کو کاری کر دیا۔ یعنی بغیر کسی وجہ سے کاری کا حکم صادر کر دیا۔ نہ قانون، نہ عدالت، نہ گواہ نہ بیان۔ کون کس کی فریاد سنے۔ فریادی دہائی دیتا رہا کوئی سننے والا نہ تھا۔ رشیدہ پر زمین تنگ ہوگئی۔ اور پھر راتوں رات رشیدہ اپنے تین چھوٹے بچوں کے ساتھ گھر سے نکل آئی۔ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کس نے مدد دی، کیسے مدد پہنچی۔ مدد تو اللہ کرتا ہے۔ اللہ نے اس پاکباز عورت کی حفاظت کی اور محفوظ ہاتھوں میں دے دیا۔

وکیل صاحب ایک خاتون اور تین بچوں کے ساتھ ''گوشۂ عافیت'' میں ملاقات کیلئے آئے اور سفارش کی کہ ان کو رکھ لیا جائے۔ ضامن بھی خود بن گئے۔ رشیدہ خوف زدہ سی اپنے بچوں کے ہمراہ اچھی لگی۔ باحیا سی پاکیزہ سی، اردو سندھی ملا کر بولتی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے پیدائش کے ساتھ ہی بہت سی صلاحیتیں بھی ودیعت کی ہیں۔ ان صلاحیتوں کو ابھارنا جلا دینا اور اس سے فائدہ اٹھانا ہمارا کام ہے۔ صلاحیتوں کو پہچاننے کیلئے کچھ نظروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مواقع تو اللہ خود دیتا ہے۔

رشیدہ بی بی کی صلاحیتیں دنوں میں اجاگر ہونے لگیں۔ ہر کام نہایت سلیقہ اور تمیز سے کرتی جس طرح بتا دیا جائے۔

گوشۂ عافیت کے انڈسٹرل ہوم میں جہاں پر آنے والی خاتون کیلئے سلائی کا سیکھنا ضروری ہے، رشیدہ نے سلائی کڑھائی سیکھنی شروع کر دی اور بہت جلد اپنی بیٹی کو خوبصورت کپڑے سی کر پہنانے لگی۔ بہت جلدی کلمہ سیکھا نماز سیکھی۔ گھر کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی۔ خدمت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ ادارے کی سب سے زیادہ مستعد اور فرض شناس

خاتون۔ بات بہت پیار سے کرتی۔تھوڑے دنوں میں ایک مکمل باحیا ہنرور خاتون بن کر سامنے آئی۔ بڑا سا دوپٹہ بڑے ڈھنگ سے اوڑھتی۔ آنکھوں میں حیا، دھیمی اور دھیرج۔

ایک دن وکیل صاحب ایک شخص اور دو بچوں کے ہمراہ آئے اور رشیدہ سے ملنے کی درخواست کی۔رشیدہ کا شوہر اپنے دو بچوں کے ہمراہ بہاولپور چلا گیا تھا۔وکیل صاحب نے اس کی بھی مدد کی۔اور پھر ایک ہفتہ بعد رشیدہ بی بی اور بہت سی خواتین کی طرح کچھ پڑھ کر کچھ سیکھ کر آنسو بہاتی اور دعائیں دیتی رخصت ہوگئی۔وعدہ کر کے گئی تھی کہ نماز خود بھی پڑھے گی اور بچوں کو بھی پڑھائے گی۔بچوں کو تعلیم دلوائے گی۔اللہ اس کی مدد کرے۔(آمین)

☆☆☆

# شکست کے رتھ پر سوار

کچھ ماہ بعد ہی نجیب عبداللہ کا رشتہ آیا۔ پوری فیملی باہر تھی۔ پاکستان گاہے بگاہے آتے رہتے تھے۔ نجیب انڈسٹریل انجینئر تھا۔ اس کے تمام کوائف کی تصدیق بھی ماموں نے اپنے کسی جاننے والے کی معرفت کرالی تھی۔ سو پردیس کی پھانس کے باوجود امینہ نے اکلوتی بیٹی کا رشتہ طے کر دیا۔

شادی سے ایک دن قبل کوریئر سروس کی معرفت ایک پارسل وصول ہوا جو فوزیہ کے نام تھا۔ امینہ نے وصول کر کے اس کو تھما دیا۔

''دیکھتے ہیں تمہاری کس فرینڈ نے تحفہ دینے کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے؟'' محبت پاش نظروں سے پیکنگ کھولتے دیکھا۔

اندر سے محض ایک تصویر نکلی۔ جس میں دو بچے پانی سے کھیل رہے تھے۔ بچہ ٹب میں بیٹھا اور بچی پاس کھڑی ہنس رہی تھی۔ فوزیہ نے اجنبی نظروں سے فوٹو دیکھا اور ماں کی جانب بڑھا دیا۔

''لگتا تو ہے جیسے یہ فوزان اور میں ہوں لیکن یہ بھیجا کس نے ہے اور کیوں؟''

امینہ نے فوٹو دیکھتے ہوئے اپنے بدن میں واضح ارتعاش محسوس کیا۔ بے اختیار فوٹو پلٹ کر دیکھا تو وہ مانوس تحریر سامنے آگئی۔

''اپنے بچوں سے محروم ایک بدقسمت باپ۔''

محض ایک جملہ تھا یا برسوں کی کہانی۔ امینہ نے بدقت فوزیہ کی طرف وہ تحریر کر دی۔

''چوبیس سال بعد ابو جی کو ہم یاد آئے۔'' اس کی آواز میں اشتیاق، دکھ، غصہ، تڑپ پتہ نہیں کیا کیا شامل تھا۔

''میں کل کی فلائٹ سے پاکستان پہنچ رہا ہوں محض اپنے بچوں سے ملنے اور ان کو اپنے سینے سے لگانے'' فوزیہ نے ڈبے کے اندر دیکھا تو ایک وزیٹنگ کارڈ بھی ملا جس کی پشت پر اسی تحریر میں یہ اطلاع تھی۔

شادی سے پہلے کے خوشگوار ماحول میں جیسے ایکدم یاسیت سی پھیلتی امینہ کو لگی۔ تلخ یادوں کے سائے اردگرد پھیلنے لگے۔ ''کل نکاح ہے، یہ شخص اب کیا کرنا

چاہتا ہے؟'' یہ سوچ ان کا سر دکھانے لگی۔ فوزان بھی صبح سے تیمور کے ساتھ مل کر شادی کی تقریب کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ وہ اس کو ڈسٹرب نہ کرنا چاہتی تھیں۔ بہرصورت یہ اطلاع انہیں اپنے تک محدود رکھنا تھی۔

گو فوزیہ یہ جان گئی تھی لیکن مزید کوئی بات کیے بغیر وہ اپنے آپ کو دوسری سرگرمیوں میں مشغول ظاہر کر رہی تھی۔ کچھ دیر میں اس کی کالج فرینڈ آنے والی تھی جو مہندی لگانے کے فن میں طاق تھی۔ فوزیہ کی مہندی بھی اس نے ہی لگانی تھی۔ باقی سب دوستوں نے بھی شام میں جمع ہونا تھا۔

''فوزان کو بتانے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔'' ماں نے کچھ دیر اسے کمرے کی چیزوں کو سمیٹتے دیکھا اور ہولے سے بولی۔

فوزیہ نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر ماں کو ہمدردی سے دیکھا اور انکو گلے سے لگالیا۔ دونوں کی دل کی دھڑکنیں زبان سے لفظ ادا کیے بغیر ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھا چکی تھیں۔ امینہ نے بیٹی کے ماتھے پر بوسہ دے کر اس کے ہاتھ کچھ لمحوں کے لئے تھام لیے۔

اگلی صبح ساڑھے سات بجے لینڈ لائن کی تیز گھنٹی سے جاگتے ہوئے لوگ چونک گئے اور سوتے ہوئے کسمسانے لگے۔ فوزان نے آگے بڑھ کر فون ریسیو کیا۔ اور اس کے چہرے پر تاثرات عجیب سے ہوگئے۔ فون بند کر کے اس نے رخ موڑا تو ماں کو پیچھے کھڑا دیکھ کر چونک گیا۔ خیالات کی یلغار نے کل سے ان کے اعصاب میں تھکن سی اتار دی تھی اور انہیں یقین تھا کہ یہ فون بھی اسی کا ایک حصہ ہے۔

''کسی صاحب کا فون تھا، خود کو فوزان اور فوزیہ کے والد صاحب کہتے ہیں، میریٹ کے کمرہ نمبر 702 میں ٹھہرے ہیں۔ اپنے بچوں سے ملاقات کے خواہشمند ہیں۔'' فوزان کی آواز میں طنز واضح تھا۔

''حیرت ہے ہماری یاد ان کو کیوں آئی؟''

''یہ تو ان سے مل کر ہی پتہ چل سکتا ہے۔'' امینہ نے پاس رکھی کرسی کا سہارا لے کر مضبوطی سے کھڑا رہنا چاہا۔

''فوزیہ کی شادی بخیر و عافیت گزرنے تک میں کسی قسم کے اشو کو زندہ نہیں کرنا چاہتا۔ مسٹر عالی وقار ہارون محض چھ گھنٹے کے لئے اس شہر میں ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ چھ گھنٹوں میں چھبیس سال کے داغ دھبے دھو دیں۔'' اب کے فوزان کے لہجے میں دکھ بھی جگہ پا چکا تھا۔

’’چھبیس سال کا ازالہ ہو یا نہیں بہر حال تم مل لو تو بہتر ہے، سالوں بعد تمہارے باپ نے تمہیں پکارا ہے۔ کیا پتہ اس میں تمہارے اور فوزیہ کے لئے کچھ خیر ہو۔‘‘

فوزان نے ماں کے چہرے کو بغور دیکھا جہاں برسوں کی مشقت کے اثرات ثبت ہو چکے تھے۔ جذباتی، نفسیاتی، معاشی اتار چڑھاؤ نے اپنے اپنے دستخط کر رکھے تھے۔

’’ٹھیک ہے میں ابھی ہو آتا ہوں۔‘‘ اس نے پاس لگے کی ہولڈر سے گاڑی کی چابی اتاری اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ ’’اچھا ہے مجھے بھی پتہ چل جائے کہ انہیں ہم کیوں یاد آئے۔‘‘

کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اس کی آواز سن کر امینہ نے آنکھیں موند لیں لیکن پھر اچانک انہوں نے بیٹے کو بے اختیار آواز دے ڈالی تاکہ وہ فوزیہ کو بھی ساتھ لے جائے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کو کچھ کہتیں وہ آندھی طوفان کی رفتار سے گاڑی گزرنے کی آواز سن کر دہل گئیں۔ پہیوں کی رگڑ سے پیدا ہونے والی آواز کی بازگشت نے فوزیہ کو سوتے سے چونکا دیا۔ وہ بے اختیار کمرے سے نکل کر ماں کو آواز دینے لگی۔ امینہ نے گیٹ کے آگے کھلے حصے میں بنے ہوئے چبوترے سے پلٹ کر اندر جاتے ہوئے غائب دماغی کی سی کیفیت محسوس کی۔ انہیں لمحہ بھر کو لگا فوزان نے صحیح سوچا تھا ہمیں فوزیہ کی شادی تک کسی ایشو کو زندہ نہیں کرنا چاہیے۔ بہت ہی اچھا ہوا کہ ان کی آواز اس تک نہیں پہنچی اور وہ چلا گیا۔

’’سب خیریت تو ہے امی! آپ پریشان کیوں لگ رہی ہیں۔ کس کا فون آیا تھا کچھ دیر پہلے۔ فوزان کہاں ہے؟‘‘ اس نے فکرمندی سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا تو ماں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنے اور فوزیہ کے مشترکہ بیڈروم کی جانب بڑھ گئیں۔

’’تمہارے والد صاحب شہر میں موجود ہیں ان کا ہی فون آیا تھا اطلاع دینے۔ اب فوزان ان کی طرف گیا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ پہلی بار باپ کی آواز سن کر اس طرح نہیں چونکا جیسے ردعمل کا مجھے خیال تھا۔‘‘ اب بھی وہ بات کرتی سن سی لگ رہی تھیں۔

’’انہیں کبھی ہمارا خیال نہیں رہا۔ اب بھی عین میری شادی والے دن وہ ہم سب کو ڈسٹرب کرنے آئے ہیں۔ وہ ایک خود غرض اور اذیت پسند انسان محسو

س ہوتے ہیں۔ وہ آپ کے حق میں بھی ظالم تھے اور ہمارے لیے بھی۔ یہ ہی وقت ملا تھا انہیں ہم کو یاد کرنے کا؟'' فوزیہ کی آنکھیں لبالب آنسو سے بھر گئی تھیں۔ رندھی آواز میں کہتے ہوئے وہ ماں کے گلے لگ گئی۔

''اسی لیے میں نے فوزان کو بھیجا ہے کہ کہیں وہ خود یہاں آ کر مزید کوئی ڈرامہ نہ کریں۔'' امینہ نے اس کے سر کے بالوں کو چومتے ہوئے کہا۔'' گھر میں موجود تمہارے نانا، نانی یا کزنز کو اس کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے ورنہ خواہ مخواہ ایک ہنگامہ سا ہو جائے گا۔فوزان کی فکر ہے مجھے، جس طرح اور جس کیفیت میں وہ گیا ہے اللہ کرے خیریت کے ساتھ ہی واپس آئے۔''

امینہ کی کیفیت اسٹیرائڈ لیے ہوئے شخص کی سی تھی جسے درد ختم کرنے کے لئے سن کر دیا جاتا ہے۔ کیفیت مرض میں فرق پڑے یا نہ پڑے لیکن مریض کے ذہن تک تکلیف کی لہریں نہیں پہنچ پاتیں بلکہ پہنچنے کے باوجود ذہن اس کو تکلیف کے خانے میں فٹ نہیں کرتا۔

امینہ بھی کم و بیش اس عالم میں تھیں کچھ عرصہ قبل ہی یہ گھر انہوں نے کرایہ پر لیا تھا۔اس سے پہلے ماں باپ کے ساتھ ہی رہتی تھیں جہاں اوپر کی بنی دو منزلیں دونوں بھائیوں کی تھیں۔ والدین کے تین کمروں کے گھر کا ایک کمرہ جس کا راستہ پچھلی گلی سے بھی تھا، امینہ کے والد نے امینہ کی شادی کے بعد کسی اکیڈمی کو کرایہ پر دے رکھا تھا۔ سالوں امینہ کے ساتھ اس کے والدین نے بھی کم جگہ پر وقت گزارا۔ انسانوں میں دکھ بھی ہوتے ہیں اور سکھ بھی، سخت جملے بھی تو پھوارسی باتیں بھی، سختی بھی نرمی بھی۔ امینہ کے ارگرد بھی انسان ہی تھے، سب کچھ انسانوں جیسا ہی تھا۔لیکن یہ بات طے تھی کہ ہر ایک امینہ اور بچوں سے ہمدردی رکھتا تھا۔ یہ ہی بات امینہ کو ان سے باندھے رکھتی تھی۔ جذباتی طور پر بھی اور معاشرتی طور پر بھی۔ والدین تو خیر ہوتے ہی سراپا محبت ہیں ان کی بظاہر کم میٹھی باتیں بھی اصل میں لب شیریں ہی ہوتی ہیں۔ امینہ اپنے والدین کی بے انتہا شکرگزار تھیں جنھوں نے اتنے کٹھن وقت میں ان کے بچوں کو بھی اپنی آغوش میں لیا جب باپ اور اس کے گھر والے ایسے بے نیاز بن چکے تھے جیسے جوس کا خالی کین......استعمال کے بعد کہاں گیا، کس نے اٹھایا، استعمال کرنے والے اس سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ ایسے میں بچوں کی ننھیال نے انہیں گلے لگایا۔اس کی وجہ محض اس گھرانے کا دینی اقدار سے تعلق تھا۔خدا سے خوف کا عنصر ہی انسانوں کو درست رکھتا ہے۔ اور خدا

سے محبت اعمال میں حسن دیتی ہے۔ امینہ میں یہ دونوں باتیں اور بہن بھائیوں کی نسبت زیادہ ہی تھیں۔ سوخوشحالی دیکھنے کے بعد بھی ان میں اوران کے بچوں میں پھلدار درخت کی سی کیفیت تھی۔

ایسے میں جب ہارون ربانی نے سالوں بعد آواز دی تو انہوں نے بیٹے کو بھیج دیا بنا چوں چرا کیے۔ پتہ نہیں صحیح فیصلہ تھا یا غلط، وہ مستقل یہ یہی سوچ رہی تھیں۔ گھڑی کی سوئیاں ایک گھنٹہ آگے کا وقت دکھا چکی تھیں۔ آٹھ بج چکے تھے۔ کچھ ہی دیر میں سب ہی اٹھ جاتے اورفوزان کی غیر موجودگی کا جوازان کو گھڑنا پڑتا۔

باورچی خانے میں کام والی کے ساتھ ناشتہ کے انتظامات کرتے ہوئے ان کو اپنا آپ بے جان لگ رہا تھا۔ ''خود غرض ہیں ہمیں ڈسٹرب کرنے آگئے ہیں۔'' فوزیہ کے باپ کے لئے کہے گئے جملے ذہن میں چکرا رہے تھے۔ چکن سینڈوچ کی ٹرے کو ریپنگ شیٹ میں لپٹتے ہوئے انہوں نے بے اختیار ایک گہری سانس لی۔ فوزان سامنے ہی کھڑا تھا۔

''تم کب آئے؟''

''ابھی۔''

''بہت جلدی آگئے۔ سالوں بعد ملاقات اتنی جلدی ختم؟؟'' امینہ حالانکہ فوزان کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کررہی تھیں لیکن اتنی مختصر ملاقات کی انہیں امید نہ تھی۔

''کچھ لوگ بے حد خود غرض ہوتے ہیں اور ہمیشہ ہی ایسے رہتے ہیں۔ رشتے، وقت، حالات ان کی اس صفت پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ ایسے ہی ایک شخص سے آپ کی شادی ہوئی تھی اور وہی پھر ہمارا باپ بنا...... میں اس موضوع پر فوزیہ کی شادی بخیر وعافیت گزرنے تک کوئی ڈسکشن نہیں کرنا چاہتا۔'' پتھریلے لہجے میں کہتے ہوئے فوزان کے لفظ لفظ سے کڑواہٹ ٹپکتی دکھائی دے رہی تھی۔ نہ جانے ایسا کیا ہوا تھا کہ وہ کسی بھی نرم گرم جذبے کی آنچ سے پگھلے بنا ہی لوٹ آیا۔ امینہ کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

''سالوں بعد بھی میرے بچے پیاسے ہیں!'' فوزان کی آواز سن کر فوزیہ ایسے بے تابی سے قریب آئی جیسے باپ کو فوزان کی آنکھوں سے دیکھ لینا چاہتی ہو۔ اس کی آنکھیں بھائی کے چہرے پر ایسے رنگ تلاش کررہی تھیں جن میں محبت، چاہت، مان اور خوشیاں ہوں لیکن وہ بہن کو دیکھ کر یکدم خاموش ہوگیا تھا۔ اچانک اس نے فوزیہ کے دونوں کندھوں پر اپنے

ہاتھ جمائے۔

''تم بھول جاؤ فوزیہ کہ ہمارے باپ نے ہمیں پکارا تھا۔ انہیں اپنے وسیع وعریض کاروبار کے لئے قابل بھروسہ مددگار درکار ہیں۔ اس نفسانفسی کے دور میں سمندر پار بیٹھ کر اولاد برسوں بعد انہیں محض اپنے مطلب کے لئے ہی یاد آئی۔''

وہ نیم کی نمولی کا سا تلخ ہو رہا تھا اور رنگ بھی ایسا ہی زرد سا لگنے لگا تھا۔

''میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بھی ناخوشگوار بات تم کو بتائی جائے لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر تمہیں صاف صاف نہ بتائی تو تم خلجان میں رہوگی اور نجیب عبداللہ بے چارہ اپنی شادی انجوائے نہ کر سکے گا۔'' فوزان نے اچانک ہی لہجہ شگفتہ کر لیا تو بھائی کو ساکت کھڑی سنتی فوزیہ میں ایسی معمولی جنبش ہوئی جیسے مورتی غلطی سے ہل گئی ہو۔

''ارے دلہن بڑی لائق ہے شادی کی صبح ہی ہمارے لیے ناشتے بنا رہی ہے۔'' ایک چہکار ابھری تو سب بے اختیار اپنے رخ تیزی سے اس طرف کر لئے، مصباح بڑے ماموں کی بیٹی شوخ نظروں سے دیکھتی ہوئی کچن میں آ گئی۔

''تم اٹھ گئیں یا سب اٹھ گئے؟'' فوزان نے آنکھ کے اشارے سے فوزیہ کو باہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے مصباح سے سوال کیا۔ مصباح نے فوزیہ کو باہر جاتے ہوئے دیکھا۔

''چائے کا پانی پک پک کر باؤلا ہو چکا ہے۔'' مصباح کی توجہ اچانک ہی خوب تیزی سے نکلتی بھاپ کی طرف ہوگئی۔ چائے تیار کر کے فلاسک میں ڈالنے تک اس نے ماحول میں بوجھل پن محسوس کر لیا تھا مگر اسے زیادہ کرید کی عادت نہیں تھی۔

''ویسے پھوپھو آپ کا سمدھیانہ بھی خوب ہے۔ آج نکاح کی دعوت میں محض پندرہ بیس لوگوں کو لانے کی وجہ میرے پلے نہیں پڑ رہی۔ وقت بھی مغرب کے بعد رکھا ہے۔ دعوت ہو یا کوئی اور تقریب مزا ہی آدھی رات گزرنے پر آتا ہے۔'' اس نے کئی مرتبہ کی چھیڑی ہوئی بات پھر چھیڑ دی۔

''تم فکر نہ کرو تمہارا نکاح ہم تہجد کے نفل کے ساتھ کروائینگے اور رخصتی صبح کی پو پھٹنے پر۔''

فوزان نے بہ مشکل آواز کو بشاش بنایا ورنہ وہ اس وقت کسی سے بات کرنے کے موڈ میں نہ تھا۔ وہ گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے تنہائی چاہ رہا تھا جو آج کے دن ملنی ناممکن

تھی۔ تقریب کے انتظامات ماموں اور تیمور ہی کی مدد سے وہ کرر ہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اسے اسی سلسلے میں ماموں کے ساتھ جانا تھا۔

کیبنٹ سے سر درد کی گولی نکالتے ہوئے اس نے پانی کا گلاس اور گولی ماں کے آگے بڑھادی جو فرج سے پھل نکال کر کام کرنے والی خادمہ کو دے رہی تھیں تاکہ وہ ان لوگوں کے لئے شیک تیار کردے جو چائے نہیں پیتے۔ بن کہے جان لینے والا، خیال رکھنے والا ان کا بیٹا ان کے کتنے ہی جلتے احساسات پر پھاہا سا رکھ دیتا تھا۔ اب بھی امینہ نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے گلاس اور دوائی تھامی تو ان کی روح کی گہرائی سے اس کے لئے دعائیں پھوٹ رہی تھیں۔

''اللہ میرے بچوں کو اور میرے بچوں کے بچوں کو ہمیشہ اپنی عافیت میں رکھے۔''

''اور نجیب عبداللہ کو، اور میری ہونے والی بیوی کو؟؟'' فوزان کے کانوں سے گزرتی ماں کی دعاؤں نے اس کی روح کی کثافت میں جیسے ٹھنڈک کا اسپرے کر دیا تھا۔ شوخی سے سوال کرتے ہوئے اس نے ایک گولی خود بھی پھانک لی۔

''میرے بچے عافیت میں اسی وقت رہ سکتے ہیں جب ان کے ساتھی عافیت میں ہوں۔'' امینہ دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے ہاتھ کے اشاروں سے خادمہ کو کچھ سمجھانے لگیں۔

''اُف امی میں نے آپ سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ کسی سننے والی کو کام پر رکھ لیں، اب صرف ایک کام بتانے کے لئے آپ کو کتنی اشارہ بازی کرنی پڑتی ہے اس کے ساتھ۔'' فوزان نے تقریباً سماعت سے معذور کام کرنے والی لڑکی کو دیکھ کر کہا۔

''سماعت سے بے شک معذور ہے مگر سلیقہ سے بھرپور ہے، یہ کچن جو اس قدر چمکتا نظر آتا ہے۔ اس میں خاصا دخل اس کا ہے ورنہ مہمانوں کے ساتھ میں اکیلے سب کچھ نہیں سنبھال سکتی۔'' امینہ نے اندر آتی مصباح کو تیار شیک کا جگ تھمایا اور فوزان کو باہر آنے کا کہتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔ بیٹی کی رخصتی میں کچھ ہی گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ ان کا رواں رواں اس کی آنے والی زندگی کی کامیابی کے لئے دعا گو ہو رہا تھا۔

''ماں باپ کے غلط فیصلے بچوں کا نصیب بن جاتے ہیں۔ ہمارے بھی تمہاری ماں کے لئے ایسے فیصلے نے اس کی زندگی میں کانٹے بچھا دیئے تھے۔''

کمرے کا دروازہ کھلتے ہی وہ ساکت ہوگئیں۔اباجی کی رندھی ہوئی آواز میں درد کا ایک جہاں آباد تھا۔وہ فوزیہ کے سر پر ہاتھ رکھے اپنے برسوں پرانے زخموں کا حال سنا رہے تھے۔ نہ جانے کیوں؟ امینہ کے دل میں آنسو گرنے لگے۔ وہ اتنی جلدی بہہ جانے والوں میں سے نہ تھیں مگر جب سے ہارون ربانی نے اپنے بچوں کو پکارا تھا،اس وقت سے لگ رہا تھا ہر بات تکلیف دہ ہوگئی ہے، ہر زخم کچا ہوگیا ہے۔ ذرا سی ٹھیس سے مواد بہہ اٹھتا ہے۔

''جب ہم نے تمہاری ماں کی شادی کی تھی تو ہمیں اسکی خوش نصیبی پر کوئی شبہ نہ تھا لیکن ولیمہ والے دن ہی مجھے اپنی کم عقلی پر شبہ نہ رہا تھا۔ میری سب سے لائق اولاد کو ایک غلط انتخاب نے روند کر رکھ دیا۔'' اباجی کی آواز لرز رہی تھی۔ فوزیہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ خاموش، بے آواز اشک بہتے دیکھ کر امینہ کا دل جیسے کسی نے چیر کر رکھ دیا ہو۔

''بس کریئے اباجی! پرانی باتوں کو کریدنے کا کیا فائدہ۔'' وہ تڑپ کر آگے بڑھیں۔

''تمہاری ماں نے بہت احتیاط سے تمہارے لیے نجیب عبداللہ کا انتخاب کیا ہے،اس نے میری طرح چمکتی چیز کو سونا نہیں سمجھا۔آنے والی زندگی میں اگر کوئی کٹھن وقت آئے تو اپنی ماں کو اس سے بری الذمہ سمجھنا کہ اس نے تو اپنی سی بھرپور کوشش کی ہے کہ اس کی اولاد اچھے لوگوں میں عافیت سے رہے۔'' اباجی نے ذرا کی ذرا امینہ کو پلٹ کر دیکھا اور اپنی بات جاری رکھی۔

'میری امینہ نے کبھی مجھ سے شکایت نہ کی لیکن ایک لفظ سنے بغیر بھی والدین اولاد کو جان لیتے ہیں۔تم کوشش کرنا کہ خوش رہو تا کہ وہ بھی خوش رہے۔'' اباجی اپنی اولاد کے لئے بے چین تھے اور امینہ اپنی اولاد کے لئے۔

''زمانے پہلے نجیب عبداللہ کے ماموں کا رشتہ میری امینہ کے لئے آیا تھا۔ ہارون کا بھی اسی زمانے میں پیغام آچکا تھا۔ دونوں رشتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔وہ کالج کا معمولی استاد اور یہ رشید ربانی کا بیٹا۔جس نے اپنے اخبار کی وفاداریاں سرکار کے نام گروی رکھ کر راتوں رات اپنے لیے چراغاں کرلیا تھا۔ اس کے گھر سے پرانی دوستی کے نام پر میری بیٹی کا رشتہ آنا خوش نصیبی سمجھی تھی میں نے۔سب کچھ جانتے بوجھتے بھی میں نے حرام مال پر پلے وجود کو حلال طیب کمائی

کھانے والے پر ترجیح دی اور اپنی بیٹی کا نصیب اپنے ان ہاتھوں سے اجاڑ دیا۔ ابا جی اپنے دونوں ہاتھوں کو فوزیہ کے سامنے کرتے ہوئے رو پڑے تھے۔ امینہ نے تڑپ کر آگے بڑھ کر ابا جی کے ہاتھ تھام لیے۔

''خدا کے لئے ابا جی! چپ ہو جایئے۔ گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا آپ کی یہ کیفیت دیکھ کر۔''

امینہ نے رندھی آواز پر قابو پانا چاہا۔ شکر ہے فوزان سمیت کوئی اور گھر میں موجود افراد میں سے یہاں تک نہیں آیا تھا۔

''چلئے امی وہاں ناشتے پر آپ کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ آج تو خوشی کا دن ہے، کیوں کھرنڈ لگے زخم سے چھیڑ چھاڑ کریں ہم۔'' وہ ابا جی کو بازو سے تھامتی کمرے سے باہر آ گئیں۔

ان کو لگ رہا تھا وقت کو جیسے کسی نے چرخی پر تیزی سے لپیٹ دیا ہے وہ جو چند گھنڈے بیٹی کی رخصتی میں باقی تھے وہ بھی گزر گئے، شکر ہے بخیر و عافیت گزر گئے اور ولیمہ کا لمحہ بھی آ پہنچا۔

فوزان کے ساتھ گاڑی سے اتر کر وہ تقریب میں شامل ہونے کے لیے آگے بڑھ ہی رہی تھیں کہ پیچھے سے کسی کی دھیمی سی آواز میں ہنسی نے ان کو چونکا دیا۔ مڑ کر دیکھنا انکو خلاف تہذیب لگا مگر ان کے ساتھ چلتے فوزان نے بے ساختہ مڑ کر دیکھا۔

''ارے یہ تو وہی ہے!!''

کسی لڑکی کی دبی دبی سی پر جوش آواز ابھری جسے امینہ نے بہ خوبی سن لیا۔ یہ دوسرا موقع تھا ان کے لئے جب فوزان کو دیکھ کر کوئی چونک کر کہہ گیا ہو کہ ''یہ تو وہی ہے۔'' انہوں نے بے ساختہ گردن گھما کر اس آواز کے رخ پر دیکھا۔ دو ہلکی بھوری آنکھیں فوزان کی پشت پر جمی تھیں۔ انہوں نے اس لڑکی کو بغور دیکھا اور فوزان کے تیزی سے جاتے قدموں میں اٹکتے ذہن کو جھٹک کر خود بھی مسکراہٹ لبوں پر لا کر استقبال کے لئے تیار ہو گئیں۔

تقریب کے اسٹیج پر دلہن بنی فوزیہ کے چہرے پر بڑی ہی آسودہ سی مسکراہٹ تھی جو ماں پر نظر پڑتے ہی گہری ہو گئی۔ ''الحمدللہ! میرے رب تو نے مجھے سرخرو کر دیا۔'' دل میں بے اختیار محبت کا دریا بیٹی کو مطمئن دیکھ کر رب کے لئے ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ آنکھوں میں پھیلتی نمی کو انہوں نے بہ مشکل روکا اور آگے بڑھ کر بیٹی کا ماتھا چوم لیا۔ ماں کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے لاشعوری طور پر ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں کہ شاید وہ

لڑکی جو فوزان کو دیکھ کر چونکی تھی وہ نظر آجائے۔ وہ نظر میں آئی تو کہاں ؟ عروبہ سے گلے ملتے ہوئے۔ بے اختیار پہلو بدلتے ہوئے انہوں نے پاس بیٹھی بھاوج سے سرگوشی کرتے ہوئے عروبہ کے ساتھ کھڑی لڑکی کے متعلق پوچھا تو پتہ چلا کہ عروبہ کی دوست ہے، مقامی انجینئرنگ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ بھاوج نے تو مزید تفصیل یہ سمجھ کر بتائی کہ شاید فوزان کے لئے لڑکی بھا گئی ہے، جبکہ انکو تو بیٹے سے متعلق اس کی حیرت تجسس میں ڈال چکی تھی۔

''فوزان کیا ہے؟ فوزان کونسا روپ ایسا رکھتا ہے کہ لوگ چونک جاتے ہیں۔ میرا بیٹا کس میں اور کہاں ملوث ہے؟''

سوالات کا ایک بہاؤ تھا جو ان کے ذہن میں رواں تھا۔ لیکن جواب کون دیتا! آخر انہوں نے فوزان سے خود ہی بات کرنے کا سوچ لیا۔ فوزیہ کی شادی سے فارغ ہوکر اب انہیں فوزان کا ہنستا بستا گھر دیکھنے کی خواہش ہوچکی تھی۔ مگر اس سے پہلے دماغ میں ابھرتے سوالات کو حل کرنا تھا۔

اور پھر جلد ہی انہوں نے موقع ڈھونڈ لیا۔ فوزان اتوار کی صبح ناشتہ کے بعد تیمور کے ساتھ کہیں جانے کے لئے تیار تھا۔ اچانک اس کا فون آگیا کہ وہ گھنٹہ دو گھنٹہ لیٹ ہوجائیگا۔ اس کی زیر تکمیل گانوں کی البم کی اسپانسر کمپنی کے ساتھ اچانک میٹنگ طے پا گئی ہے۔ فوزان نے سیل آف کرنے کے بعد کچھ بڑبڑاہٹ کی اور قریبی صوفہ پر ٹکتے ہوئے ٹی وی آن کرلیا۔

اخبار کی ورق گردانی کرتی امینہ نے نظر بھر کر بیٹے کو دیکھا جو دھیمی آواز میں کسی گلوکار کو بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔

''بیڑہ غرق کردیا اقبالؔ کے کلام کا، یہی جب تیمور پڑھتا ہے تو بات ہی اور ہوتی ہے۔'' فوزان کا تبصرہ سن کر انہوں نے بے اختیار اخبار لپیٹ کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

''آواز تو خیر تمہاری بھی اچھی ہے، اگر یہی تم پڑھو تو یقیناً تیمور جیسا ہی خوبصورت لہجہ ہوگا۔'' ہلکی پھلکی شگفتہ آواز میں کہتے ہوئے انہوں نے بیٹے سے بات کی تو وہ ہنس پڑا۔

''ہر ماں کو اپنی اولاد میں ہر صفت اعلیٰ ہی نظر آتی ہے آپ کی طرح۔''

''نہیں مجھے تم میں گلوکاری کی اعلیٰ صفت دیکھنے کی کوئی تمنا نہیں۔''

امینہ کا جواب سن کر فوزان نے ''ہوں'' کی اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آف کر دیا۔

''اگر کبھی میں گلوکاری کرلوں تو؟''

فوزان نے ماں سے اچانک سوال کیا تو وہ حیرت سے سوچ میں پڑ گئیں کہ کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟''بالکل ممکن ہے امینہ، انسان آج کل ایسے دور میں زندہ ہے جہاں ممنوعات میں بڑی دلفریبیاں دن رات لبھاتی ہیں۔'' دل نے واضح ترین جواب دیا تو ذہن نے کہا''پھر تربیت کا فائدہ؟''

''کس سوچ میں پڑ گئیں امی حضور؟''فوزان نے ماں کو پکارا۔

''انسان سے غلطی ہوسکتی ہے لیکن غلطی پر اصرار مناسب نہیں ہوتا۔ ورنہ دل کو غلطیوں کی عادت ہوجاتی ہے۔''

''مطلب یہ ہے کہ میں ایک مرتبہ گلوکاری کرنے کی غلطی کرسکتا ہوں۔''فوزان نے دھیما سا قہقہہ لگایا۔

''بیٹا جی! غلطی کہا ہے ارادتاً کچھ کرنا دوسری بات ہے۔ ویسے آج تک مجھے یہ نہیں پتہ چلا کہ میرے بیٹے کا کونسا ایسا روپ ہے کہ راہ چلتے لوگ چونک جاتے ہیں اور مجھے علم نہیں۔'' امینہ نے فوراً ہی وہ بھی پوچھ ڈالا جوان کو الجھن میں ڈال چکا تھا۔ شوخ سے فوزان کے تاثرات یکلخت سنجیدہ ہو گئے۔

''گلوکاری کی غلطی۔'' اس نے مختصر ترین جواب اتنے اچانک دیا کہ وہ خود بھی حیرت سے چپ رہ گئیں۔

''کب؟''

ایک لفظی سوال پر فوزان نے پہلو بدلا''فوزیہ کی شادی سے خاصا پہلے تیمور کے ساتھ۔'' اس نے جواب دے کر اپنے آپ کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

''صحبت کا اثر آتا ضرور ہے...... بہتر ہے تم فاصلہ کرلو۔'' ماں نے بیٹے کو نصیحت کی، انکے لیے یہ خبر خاصی افسوس کن تھی۔ گو تیمور ان کو خود بہت پسند تھا لیکن اس کی یہ روش پسند نہ تھی۔

''امی! یہ تو اس کی خوبی ہے کہ مشہور ہونے کے بعد بھی وہ مجھ کو اہمیت دیتا ہے۔''فوزان کو تیمور سے فاصلے والی بات ناگوار گزری تھی۔

''اچھا یہ سب چھوڑو یہ بتاؤ سندس شیخ سے تمہاری منگنی کردوں تو کیسا ہے؟'' بیٹے کی خفا خفا سی شکل دیکھتے ہوئے انہوں نے بات کا رخ موڑا۔

''مجھے کوئی دلچسپی نہیں اس فیملی میں۔''

’’اچھا تو پھر خود بتا دو کس میں دلچسپی ہے۔‘‘ امینہ نے محبت سے پوچھا۔

’’بتادونگا۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ ماں نے جواب دیتے ہوئے اپنا سیل فون اٹھالیا جو وائبریٹ ہورہا تھا۔

اور پھر تین دن بعد فوزان نے اپنے سیل فون کی سکرین ماں کے آگے کرتے ہوئے ایک تصویر دکھائی۔

’’حمنہ مجید، اسٹوڈنٹ آف انجینئرنگ یونیورسٹی!‘‘ امینہ نے اس تصویر پر لکھا ٹیکسٹ پڑھ کر استفہامیہ نظریں اٹھائیں۔

’’کیسی ہے؟‘‘ فوزان نے پر اشتیاق انداز میں پوچھا۔

’’کس طور پر؟‘‘ ماں نے بیٹے کے تاثرات جانچتے ہوئے اس کو کھولنا چاہا۔

’’بطور حمنہ فوزان۔‘‘ اس نے اپنا مدعا تین الفاظ میں واضح ترین ظاہر کردیا۔

’’زندگی کے ساتھی کا چناؤ محض تصویر دیکھ کر کیسے کرسکتی ہوں میں اپنے بیٹے کے لئے۔‘‘

امینہ سنجیدگی سے کہتی ہوئی ایک بار پھر تصویر دیکھنے لگیں جہاں ایک مسکراتے چہرے کی تصویر تھی جس کی آنکھیں تک اس کی مسکراہٹ میں شریک تھیں۔ شرٹ کے ہائی نیک کالر پر بنا کام اس کی دراز گردن پر خوب جچ رہا تھا۔ سائیڈ میں پڑے بالوں کے درمیان میں میرون رنگ کی چمکدار بالیوں میں دمکتا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا تھا۔

’’ویسے لکس اچھی ہیں۔‘‘

فوزان کا شوق محسوس کرتے ہوئے انہوں نے مزید دانش نہیں جھاڑی لیکن وہ اپنے باشعور بیٹے کے لئے صرف ظاہر دیکھ کر فیصلہ کرنے کے حق میں نہ تھیں۔ ایسا تو انہوں نے فوزیہ کے لئے بھی نہ کیا تھا۔ بیٹے کے انداز بتارہے تھے کہ وہ اپنے دل کے ساتھ ماں کے دل کو بھی حمنہ مجید کے لئے راضی وخوشی کرنا چاہتا ہے۔ نہ اسے سندس شیخ سے دلچسپی ہے اور نہ خالا کی لیلیٰ شاہد میں جس کے سیاہ بال اور محبت سے بھرپور دھیما لہجہ امینہ کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ مقامی کلینک میں وہ بطور فزیوتھراپسٹ کام کرتی تھی۔ اپنے لئے اس نے کچھ اصول مرتب کیے تھے جن سے ہٹ کر جاب کرنا اسے پسند نہ تھا۔ خواتین اور بچوں کے علاوہ وہ کسی مرد کی تھراپی نہیں کرتی تھی۔ امینہ کو جاب کے لئے لیلیٰ کا یہ رویہ بہت ہی پسند تھا مگر جب وقت آیا تو فوزان نے

ان کے لئے لیلیٰ کو لیلیٰ فوزان بنانے کی گنجائش نہ رہنے دی اور حمنہ، فوزان سے منسوب کر دی گئی۔

شوخ و شنگ اور ماں باپ کی بے حد لاڈلی ذہانت سے بھرپور لڑکی حمنہ وہی تھی جو فوزیہ کے ولیمہ میں فوزان کو دیکھ کر چونکی تھی، جس کی جلترنگ سی ہنسی نے فوزان کو اپنا گرویدہ اسی دن کر لیا تھا جب تیمور کا فون یونیورسٹی لیب میں رہ گیا تھا۔ وہ زندگی کو بھرپور انجوائے کرنے والی زندہ دل لڑکی تھی جس کے ساتھ پختہ اور باشعور خیالات کا فوزان کیسے سنجیدہ ہو گیا یہ امینہ کے لئے اچنبھا ہی تھا۔

''انسان روبورٹ نہیں ہوتا ایسا کہ ایک مخصوص پروگرامنگ کے تحت چلتا رہے، فوزان کو پسند ہے یہ لڑکی، تو وہ خود ہی اپنے حساب سے اسکو ڈھال لے گا، تمہارا بیٹا بدھو نہیں ہے۔'' چھوٹی بہن نے امینہ کے متوقع خدشات سن کر اسے تسلی دی تو وہ بدقت ہی مسکرائیں۔

''فوزان کیا اسے تبدیل کر لے گا؟ کیا جبر اور دباؤ کے تحت کرائے جانے والے عمل سے گھر کی فضا خوشگوار رہ پائے گی؟ جذبات کی تلاطم خیز موجیں جب پرسکون ہوں گی تو زندگی صحیح خطوط پر چل پائے گی؟ یا زمانے ہی کے رنگ میں رنگی ایک کترن...... بے وزن، بے قیمت؟ کتنے ہی خدشات تھے جس کا جواب صرف وقت کی پرتوں میں چھپا تھا۔ منگنی سے شادی تک کے سال بھر کے وقفہ نے ان کے خدشات میں اضافہ ہی کیا۔ گو حمنہ اور حمنہ کے خاندان میں کسی رویے کی بدنمائیاں نہ تھیں۔ عزت کرنے اور عزت رکھنے والے کاروباری لوگ تھے، زمانے کے سارے دستور اور ڈھنگ کو اپنانے والے، دین اور دنیا کے درمیان معلق، عبادتیں بھی نہ چھوڑیں اور فرحتیں بھی نہ چھوٹیں۔ ایسا بھلا امینہ نے کب چاہا تھا اپنی نسل کے لئے۔ لیکن انسان کا ہر چاہا پورا ہونا تو صرف جنت ہی میں ممکن ہے۔

سو دسمبر کی ایک یخ رات کو حمنہ ان کے گھر دلہن بن کر آ گئی۔ انہوں نے بھی اس کے گھر میں اترتے ہی ہر خدشہ کو خوشی میں بدلتے محسوس کیا اور مفاہمت کے اصول ذہن میں تازہ کر لیے۔ کچھ عرصہ بخیر و خوبی لحاظ و مروت میں گزر گیا۔ پہلے ماتھے کی شکن امینہ کے چہرے پر اس وقت پڑی جب حمنہ کا کزن اسے میکہ لے جانے کے لئے آیا اور وہ اسی طرح خوشبو میں بسی اس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئی جیسے فوزان کے

ساتھ نکلنا اس کی عادت تھی۔ بدقت انہوں نے اپنے آپ کو تلخ ہونے سے روکا اور منظر سے ہی ہٹ گئیں۔ پھر ماتھے کی دوسری اور تیسری میں تو کیا، پرانے والی شکن میں کوئی خاص فاصلہ نہ تھا۔ ماحول کا فرق بہت کھل کر سامنے آ رہا تھا۔ حمنہ کیکٹس نہ تھی لیکن چنبیلی بھی وہ اس کو نہیں کہہ سکتی تھیں۔ حالانکہ وہ ان کے ساتھ احترام کا رویہ ہی رکھتی تھی لیکن اس کے طور طریقے سہنا ان کے لئے نیا تجربہ تھا۔ وہ گھر جہاں شام گئے سے پہلے ٹی وی کی آواز بھی نہ پھیلتی تھی، صبح ہی سے ڈیک اور بھارتی فلموں کے شور شرابے میں غرق ہو جاتا۔ انہوں نے حمنہ سے بات کرنے کے طریقہ کو سوچنا شروع کر دیا۔

ابھی وہ اسی سوچ بچار میں تھیں کہ ہارون ربانی کے فون نے ایک بار پھر بھونچال کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ اب کی بار فون حمنہ نے ریسیو کیا تھا، وہ تو یہ سن کر ہی خوش ہو گئی تھی کہ دوسری طرف فوزان کے والد ہیں جن کا امریکہ سے فون آیا ہے۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے ان سے بڑی خوبصورتی سے باتیں کیں جس کے جواب میں ہارون ربانی نے فوزان اور اس کی شادی کے تحفہ کے لئے اس کی پسند پوچھی تو اس نے بلا جھجک امریکہ یاترا کا چناؤ کیا۔

''فوزان کو راضی کرنا تمہاری ذمہ داری باقی سب میری۔'' قہقہہ لگاتے ہوئے ہارون ربانی نے جیت کی سی خوشی محسوس کی۔

حمنہ نے عقلمندی یہ کی کہ ساس سے کسی بھی بات کا ذکر کیے بغیر محض اتنا کہا کہ کسی ہارون ربانی صاحب کا فون آیا تھا۔ فوزان کو پوچھ رہے تھے۔ میگزینز کی چھانٹی کرتے امینہ کے ہاتھ پتھر کے ہو گئے۔

''اس شخص کو ہمارے تازہ بہ تازہ کوائف کہاں سے مل جاتے ہیں زندگیوں میں آندھیاں پیدا کرنے کے لئے؟'' امینہ نے بے اختیار جھرجھری لی۔ ہارون ربانی نے اس دفعہ عمارت کی اس اینٹ پر ہاتھ رکھا تھا جو تازہ بہ تازہ جوڑی گئی تھی اور دوسری اینٹوں کے ساتھ وہ ابھی اس مضبوطی سے نہ جڑی تھی کہ اسے ہلانا مشکل ہوتا۔

ان دنوں کسی مشہور بوتیک سے ایک خطیر رقم کی سلائی کا کام امینہ اور فوزان کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔ کپڑوں کی یہ لاٹ ایکسپورٹ ہونا تھی اس لیے کوالٹی میں خصوصی دھیان رکھا جا رہا تھا۔ ماں نے بیٹے کے ذہن کو انتشار سے بچانے کے لیے ہارون ربانی کے

فون کا ذکر موخر کر دیا تھا لیکن حمنہ پر امریکہ آنے کی دعوت دے کر سسر نے اپنی شخصیت کا اچھا تاثر قائم کر دیا تھا۔ اس نے پہلی فرصت میں میاں سے فون کا ذکر بڑے ہی پر جوش انداز میں کیا۔

فوزان نے اس کی تمام باتیں سن کر خاموشی سے اپنا لیپ ٹاپ آن کر لیا۔ فوزان کی خاموشی حمنہ کو کھل رہی تھی۔

''آخر آپ اپنے والد پر اعتبار کرنے میں کیوں ہچکچاہٹ کا شکار ہیں؟'' بیوی کے دباؤ ڈالنے پر فوزان کی تیوری پر بل پڑ گئے۔''

''یہ ہماری فیملی کا ذاتی معاملہ ہے۔'' اس کی پہلی مرتبہ سرد مہری سے دیئے گئے جواب نے حمنہ کو جھنجھلا دیا۔ امریکہ جانے کے سارے رنگین تصورات فوزان نے ایک ہی جھٹکے میں چکنا چور کر دیئے۔

''ہارون ربانی نام کے کسی انسان سے اگر تمہارا رابطہ کسی بھی ذریعہ سے ہوتا پایا گیا تو یہ تمہارے حق میں بہت برا ہو گا۔''

انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کرتے ہوئے فوزان نے حمنہ کے روٹھے تاثرات کی پروا نہ کی جس پر اس کی جھنجھلاہٹ غصے میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے اپنے والد کو بیوی کی ناز برداری ہی کرتے دیکھا تھا۔

''یہ کیسا میاں ہے جو خواہ مخواہ اکڑ دکھا رہا ہے۔'' ہے نا درزی ذہنیت! کہاں سے تبدیل ہو گی۔ ناحق میں نے اس سے شادی کی۔''

آن کی آن میں ساری راحتیں کلفتوں میں تبدیل ہو گئیں۔ بہرحال اتنی سمجھداری اس میں تھی کہ دل میں پھٹتے آتش فشاں کا لاوا زبان سے باہر نہ آیا۔ ''اور ہاں ایک بات اور...... آئندہ آپ کو مناسب حلیے کے بغیر اپنے ساتھ کہیں نہیں لے جا سکتا۔ مجھے نہیں پسند کہ کوئی تم پر تبصرہ کرے۔''

حمنہ تو پہلے ہی تپی ہوئی تھی اس کی اس بات نے تو اس کے پتنگے ہی لگا دیئے۔

''آپ ان گھٹیا ذہنیت کے لوگوں کے لئے کس کس چیز پر پابندی لگائیں گے؟ اور آخر کس نے کیا کہہ دیا مجھے جو یہ سزا دی جا رہی ہے؟''

اب کے لاوا باہر آ چکا تھا۔ فوزان نے تیوریوں پر بل ڈال کر بیوی کو دیکھا۔ ''جو میں نے سنا ہے وہ میں سنانا نہیں چاہتا۔ تمہارے لیے یہ ہی مناسب ہے کہ تم اپنے آپ کو محفوظ کر کے نکلا کرو۔ کم از کم میں تمہیں اپنے ساتھ تمہاری پسند کے مطابق نہیں لے جا سکتا۔ شاید

تمہارے لیے وہ بڑی بات نہ ہو مگر میرے لیے ہے۔''

فوزان کو فیصلوں پر مضبوطی ماں باپ دونوں سے ورثہ میں ملی تھی۔ حمنہ نے کتنی ہی ناراضگی دکھائی، خفگی ظاہر کی لیکن بالآخر اسے فوزان کا فیصلہ قبول ہی کرنا پڑا۔ اس سے پہلے کہ امینہ کچھ کہتیں۔ وہ تو بدستور اسی الجھن میں تھیں کہ کسی طریقے سے بہو کو راضی کیا جائے کہ وہ اپنے ڈھنگ بدلے، فوزان نے ماں کو سرخرو کر دیا کہ اس کی تربیت بامعنی رہی۔

فوزان نے بھی ہر مرتبہ حمنہ کے فیصلہ ماننے پر بری قدردانی کی۔ جب اس نے سر ڈھکنا شروع کیا تو میاں نے اسے سونے کی انگوٹھی کا تحفہ دیا جس میں لگے قرمزی پتھر میں دھاریاں سی تھیں جب وہ حجاب میں آئی تو ساس نے بے اختیار اپنے ہاتھ سے چوڑی اتار کر اسے پہنا دی اور وہ ان کی اتنی بے ساختہ خوشی سے دنگ رہ گئی۔ ''میری سوہنی بیٹی!'' انہوں نے اس کا ماتھا چوم کر فوزان کو مسکرا کر دیکھا جس نے ہاتھوں میں پکڑے لفافے سے سنہری جھلملاتی چین نکال کر ماں کے ہاتھ میں تھما دی۔''

''امی حمنہ بڑے فائدے میں رہی، میں تو صرف یہ چین دے رہا تھا آپ نے تو تولہ بھر سونا دے دیا۔''

شرارتی نظروں سے بیوی کو دیکھتے ہوئے وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ نت نئے اسٹائلش کپڑوں اور سنورے رہنے کی شوقین اس کی بیوی دوسرے مردوں کی نگاہوں کے لامحدود تیروں سے محفوظ ہوگئی ہے، یہ تصور ہی اس کے لئے خوشگوار تھا۔ حمنہ نے بھی اپنے میکہ کی روش سے بالکل مختلف تبدیلی کو دل سے قبول کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی کہ اس کے خمیر میں خواہ مخواہ کی عداوت رکھنا شامل نہ تھا اور اسکی سسرال بھی اس کے لئے آسان ہی تھی۔ تھا ہی کون، اسکی ساس اور فوزان، نند تو شادی میں شریک ہونے محض ہفتہ بھر کے لئے آئی تھی، اب کئی ماہ تک تو آنے کے آثار نہیں تھے۔

اتنی سب سہولتوں کے باوجود اسے رہ رہ کر دو ماہ قبل ہارون ربانی کی دی گئی امریکہ آفر یاد آتی رہتی تھی۔ ہنی مون حمنہ فوزان نے بھی ملک سے باہر سری لنکا میں منایا تھا لیکن امریکہ تو بس امریکہ ہے، اس کا سری لنکا سے کیا مقابلہ! حمنہ اکثر سوچتی لیکن فوزان سے نہ کہتی، وہ کتنی بھی شوخ ادا سہی لیکن اپنے گھر کو چخ چخ سے آلودہ نہیں کرنا چاہتی تھی، اس لیے پھر کبھی اس نے ہارون ربانی کے فون آنے پر فوزان سے اپنی خواہش کا اظہار نہ کیا۔ ہاں وہ ان سے ضرور میٹھے لہجے میں بات کر کے

ان کی گڈ بکس میں آ گئی تھی۔ اپنے سسرا سے خزانے بھرے غار کے دربان محسوس ہوتے تھے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان سے بے التفاتی دکھا کر اپنے سسرال کی سی حماقت کرے۔ اس کے دل پر چرکا نہ لگا تھا سوا سے بہتی گنگا سے احتراز کرنا حماقت ہی لگ رہا تھا۔ ملک کی تیزی سے ہوتی ابتر صورتحال نے باہر جا کر سیٹل ہونے کی خواہش شدید تر کر دی تھی، ہارون ربانی کے ہوتے یہ سب با آسانی ہوسکتا تھا لیکن فوزان......

یہ آدمی تو بس محدود درجہ پر ہی زندگی گزار کر بوڑھا ہونا چاہتا ہے، باہر نکلے اپنا ایک برانڈ بنائے۔ دنیا پر چھائے......لیکن نہیں مقامی مارکیٹ میں ''آرٹسٹ'' کا لیبل لگا کر خوش ہے۔ اور اس سے زیادہ اماں جان ہماری جن کو دنیا کے سسٹم میں ہر طرف شیطانیت ہی نظر آتی ہے۔'' ساس کے لئے شکر ہے اس نے سوچوں میں بھی لحاظ رکھا ورنہ بدلحاظی کی انتہا بھی کر دیتی تو کون تھا جو پکڑتا۔ ''عورتوں کے لئے ٹینس کا لباس ہو یا نیٹ کے دوپٹے کا فیشن، سب انہیں بدی کا ایجنڈا لگتا ہے۔''

اسے پرسوں اماں جان کے ساتھ فوزان کے ماموں کے ہاں دعوت میں جانا یاد آ گیا۔

کیسے شوق سے اس نے سنہری رنگت کی اور گنزا نیٹ کا قمیض دوپٹہ پہنا تھا جس پر کالے ستاروں کی کیریاں بنی ہوئی تھیں۔ چھوٹی بڑی کیریاں اس کی نیٹ کی آستینوں کے نیچے سے جھلکتی جلد پر شاندار لگ رہی تھیں۔ سیاہ بالوں کا اونچا سا جوڑا دراز گردن کو نمایاں کرتا ہوا حمنہ کو محفل میں خوش ادا بنا رہا تھا۔ کسی کو حمنہ بھابھی کے لپ اسٹک شیڈ نے متاثر کیا، کسی کو ان کے سراپہ میں مقناطیسیت لگی، کوئی کالے نگوں کی چوکور بالیوں کی تعریف کر رہا تھا تو کچھ کو وہ اپنی ادھوری انجینئر نگ کی تعلیم سے ہی ہمدرد بنا گئی۔

حمنہ نے یہ سب خوب محسوس کیا، وہ دعوت سے واپسی پر بے حد مسرور تھی۔ اس کی شادی کو سال بھر ہو چکا تھا۔ اپنے سسرال سے اب تک ہونے والی تمام دعوتوں میں اس کے لئے سب سے زیادہ پر لطف دعوت یہی تھی۔ شادی کے سال بھر نے اسے خوب تبدیل کر دیا تھا۔ ہنستی ہوئی آنکھوں میں خوب چمک آ گئی تھی، اور روپ دمک اٹھا تھا۔ ناک کی لشکارے مارتی ہیرے کی لونگ خوب جچ رہی تھی۔ زندگی کے خوبصورت رنگ اس پر چھائے نظر آتے تھے۔ وہ اپنے بارے میں تعریفیں کانوں سے سن چکی تھی کہ فوزان نے تعریف تو دور کی بات نظر بھر کے بھی نہ دیکھا، دعوت سے واپسی پر

بھی اس کا موڈ آف، حمنہ نے محسوس کر لیا تھا، جسے اس نے وقتی کیفیت سمجھ کر نظر انداز کر رکھا تھا لیکن اماں جان کے تبصرے نے تو اس کا مزہ بالکل ہی کرکرا کر دیا۔ جب اگلی صبح فوزان کے ساتھ بوتیک جانے کے بجائے وہ اپنے ذاتی کپڑوں کی خریداری کرنے کے ارادے سے گھر پر رک گئیں۔ ویسے بھی فوزان نے عمدگی سے کام سنبھال لیا تھا اب وہ باقاعدگی سے نہ جاتی تھیں سو یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔

حمنہ چھوٹے موٹے کاموں سے فارغ ہو کر بھاپ اڑاتا چائے کا مگ تھام کر ٹی وی اور وی سی آر آن کر چکی تھی جہاں سے آنے والا فیشن شو وہ انہماک سے دیکھتی ہوئی گاہے بہ گاہے ادھر ادھر چلتی پھرتی ملازمہ پر نظر ڈال لیتی، جو کام کرتے ہاتھ روک کر ''بھابی جی'' کی تفریح سے خود بھی سیر ہونا چاہتی اور ایسے میں اس پر حمنہ کی نظر پڑ جاتی تو وہ اس کو سخت لہجے میں ڈپٹ کر چائے کے گھونٹ بھر لیتی۔ امینہ اپنے کمرے کے کھلے دروازے سے اپنی الماری ترتیب دیتے ہوئے اس ''حقیقی'' ڈرامہ پر اچٹتی نگاہ ڈال لیتیں جس کا تیسرا کردار شانی (ملازمہ) بقیہ دونوں کرداروں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا مگر اس کی اوقات مستقل گڑبڑ کر رہی تھی۔

کچھ لمحے انہوں نے کام سے ہاتھ روک کر کچھ سوچا اور باہر قدم بڑھا لیے۔ حمنہ نے ذرا کی ذرا اسکرین سے نظریں اٹھائیں اور پھر خالی مگ شانی کو آواز دے کر تھماتے ہوئے وی سی آر آف کر دیا۔ بھائی سنگاپور سے واپسی پر ڈھیر کیسٹس لائے تھے۔ انڈین اور انگریزی فلموں پر مشتمل۔ اسی ڈھیر میں سے وہ یہ فیشن شو کا لیبل لگی کیسٹ میکہ سے اٹھا لائی تھی، مگر یہاں ٹی وی محض ٹی وی لاؤنج میں تھا، اس پر اماں جان کی خاموش نگاہوں اور زبان سے صاف ظاہر ہوتی ناپسندیدگی......

''لو جی اب اماں جان کا بھاشن سن کر سارا فیشن جھاڑ و دماغ سے۔'' اس نے بے اختیار ان کو اپنے قریب بیٹھتا دیکھ کر سوچا'' حمنہ بیٹا! رات تو تم بہت اچھی لگ رہی تھیں، کہاں سے خریداری کی تھی اس نیٹ کی؟'' امینہ کے سوال نے حمنہ کو حیران کر دیا اسکرین پر ان کی لمحہ بھر کو ٹکتی نگاہوں سے وہ متذبذب سی تھی۔ اماں جان تفسیر بھائی دبئی سے لائے تھے، آپ کو پسند ہے تو میرے پاس اتنا پیس بچا ہے کہ دوپٹہ بن سکتا ہے یا قمیض۔ آپ لے لیں۔''

اس نے کھلے دل سے آفر کی تو امینہ مسکرا اٹھیں۔

☆☆☆

''شکریہ بیٹاً بس دل چاہتا تھا کہ اچھا ہوتا تمہارے بازو ڈھکے ہوتے اوردوپٹہ غف ہوتا، سب ہی تو خواتین نہ تھیں نا بیٹا، بیٹے تھے، داماد تھے، بہنوئی، کزنز......'' امینہ نے اتنی بات کہہ کرتوقف کیا اوراس کے تاثرات دیکھنے لگیں۔انہوں نے بدمزگی سے بچنا چاہا تھا لیکن پھر بھی ایسا نہ ہوسکا اورحمنہ پورادن گوند لگے ہونٹوں کے ساتھ روزمرہ کے معمولات میں گم رہی۔ یہ گوند صرف امینہ کو جتانے کے لئے تھی ورنہ گھنٹوں کے حساب سے فون کالز میں گفتگو جاری تھی۔ ہاں ٹی وی کی قریب وہ پھٹکی بھی نہیں۔غنیمت تھا کہ احتجاج کرتی تھی، فساد نہ کرتی تھی۔زندگی میں انسانوں کی انسانوں سے توقعات کم ہی پوری ہوتی ہیں، تازگی کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ خوش گمانیاں ہی رکھنی پڑتی ہیں۔ حدیث تو ستر مرتبہ اچھے گمان کی تعلیم دیتی ہے،امینہ یہ ہی سوچ کر اپنے ماتھے پر شکن کو مسکراہٹ میں تبدیل کرلیتیں۔مشکل کام تھا لیکن نیت کی درستی نے سہل کردیا۔

خوشگوار موڑ فوزان کی شادی کے ڈیڑھ سال بعد نشوا کی پیدائش پر آیا۔

(جاری ہے)

# ملکہ ارجمند بانو ممتاز محل

ملکہ ارجمند بانو مغل بادشاہ شاہ جہاں کی چہیتی ملکہ تھی۔ وہ یمین الدولہ آصف خان کی بیٹی تھی جو آصف جاہ کے نام سے مشہور تھا۔ آصف جاہ ملکہ نور جہاں کا حقیقی بھائی تھا اور عہد جہانگیری میں بڑے جاہ واقتدار کا مالک تھا۔ ارجمند بانو کی والدہ مرزا غیاث الدین علی قزوینی کی صاحبزادی تھی۔ جو عہد اکبری کی فوج کا میر بخشی تھا۔

ارجمند بانو ۱۴ رجب ۱۰۰۱ھ کو پیدا ہوئی۔ والدین نے اس کی تعلیم وتربیت بہت اہتمام سے کی۔ وہ اپنی پھوپھی نور جہاں کی طرح بے پناہ حسن کی مالک تھی۔ حسن خداد کے ساتھ ساتھ سلیقہ شعاری، علم ودانش، ادب وتمیز میں بھی لاثانی تھی۔ جب بادشاہ جہانگیر کو اس کی جملہ خوبیوں کی بابت معلوم ہوا تو اس نے اسے نوجواں شہزادے خرم شاہ جہاں کیلئے مانگ لیا۔ ۱۰۲۱ھ، ۱۶۱۲ء میں شہزادہ خرم اور ارجمند بانو کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ رسوم شادی اعتماد الدولہ کے عظیم الشان محل میں ادا کی گئیں۔ جہانگیر بادشاہ نے خود اس شادی میں شرکت کی۔ دولہا نے اپنے ہاتھوں سے ہیروں کا ہار دلہن کے سر پر پہنایا اور اس کا مہر پانچ لاکھ مقرر ہوا۔ ارجمند بانو شاہ جہاں کی تیسری بیوی تھی۔ اس کے بعد شاہ جہاں نے کوئی اور شادی نہیں کی۔

ارجمند بانو کے حسن سیرت اور حسن صورت کی وجہ سے شاہ جہاں اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ وہ بڑی عالمہ، فاضلہ، سخن فہم اور سخن سنج خاتون تھی اور شاہ جہاں کے مزاج پر پوری طرح حاوی تھی۔ سفر ہو یا حضر وہ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا۔ جب بادشاہ تخت نشین ہوا تو تاج پوشی کے موقع پر اس نے اپنی ملکہ کو ''ممتاز محل'' کا خطاب دیا۔ جس کے معنی ہیں ''محل کا زیور'' اور ایک بڑی جاگیر بھی عطا کی۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے مثالی محبت کرتے تھے۔ شاہ جہاں اس کے مشوروں کو بہت اہمیت دیتا اور وہ اپنے اثر ورسوخ کو رعایا کے حق میں ہمیشہ مفید ثابت کرتی رہی۔ اس نے بہت سے لوگوں کی جان بخشی کروائی اور بے شمار قیدیوں کی سزا میں تخفیف کروائی۔ اپنی رحمدلی اور نرم مزاجی کی

بدولت اس نے بادشاہ سے خصوصی احکام حاصل کیے تاکہ قیدیوں کیلئے رعایت حاصل کی جائے۔ وہ غربا ومساکین کے مسائل خود سنتی اورانہیں بادشاہ تک پہنچاتی۔ان تمام امور کیلئے اس نے اپنی خاص خدمت گار ستی النساء کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی۔ ستی النساء اپنے اخلاق، شائستگی، حسن گفتگو، ادب وتمیز اور فن طب میں اپنی مہارت کی وجہ سے بہت جلد ملکہ کی منظورِ نظر بن گئی تھی اور ملکہ نے اسے اپنی مہر دار خاص مقرر کر دیا۔ یہ شاہی حرم میں بہت اونچا اور معزز عہدہ تھا۔اس کی علمی قابلیت کی وجہ سے اسے اپنی بڑی بیٹی جہاں آرا کی اتالیق بنا دیا تھا۔ وہ خیرات خانہ کی منتظم بھی تھی۔ ملکہ کے کہنے پر وہ غریب اور محتاج عورتوں کی تلاش میں رہتی اور مستحق اور کنواری لڑکیوں کی متلاشی رہتی تاکہ عزت وآبرو کے ساتھ ان کی شادی کروا سکے۔ وہ ملکہ کو ایسی خواتین کے بارے میں خبریں پہنچاتی اور ملکہ بادشاہ کی وساطت سے ایسی خواتین کی دل کھول کر مدد کرتی۔

ملکہ کو شاہی خزانہ سے بارہ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا۔ وہ اس وظیفے کا بڑا حصہ بیواؤں، غریبوں، حاجت مندوں کی امداد کرنے میں صرف کر دیتی۔ ارجمند بانو نے شاہ جہاں کے دل پر اسی طرح حکومت کی جس طرح نور جہاں نے جہانگیر کے دل پر حکومت کی تھی۔ ارجمند بانو شاہ جہاں کے غم اور خوشی میں برابر اس کے ساتھ رہی۔ اس کے ہر دکھ سکھ کو اپنا جانا۔ اپنا تن من دھن اس پر نچھاور کر دیا۔ وہ دل وجاں قربان کر دینے والی بیوی تھی۔ جنگی معرکوں میں وہ ہمیشہ بادشاہ کے ساتھ رہتی۔ اپنے شوہر کی محبت میں اس نے اپنے باپ کی مخالفت مول لے لی۔ اس نے ہمیشہ شاہ جہاں کی سیاسی مشیر کے طور پر کام کیا۔

اس کا حسن بے مثال تھا۔شاعروں نے اس کے حسن پر قصیدے لکھے ہیں۔ ۱۰۴۰ھ ۱۶۳۱ء میں شاہ جہاں دکن گیا تو ممتاز محل کو بھی ساتھ لے گیا۔ برھان پور کے مقام پر اس کے ہاں ایک بچی کی ولادت ہوئی مگر بچی کی پیدائش کے بعد ملکہ جانبر نہ ہوسکی اور ۷ اجون کو راہی ملک عدم ہوئی۔

ایک روایت ہے کہ مرنے سے پہلے ملکہ نے بادشاہ سے دو وعدے لیے کہ وہ اس کے بچوں کی انتہائی نگہداشت کرے گا اور انہیں سوتیلی والدہ کے سپرد نہیں کرے گا۔ دوسرا یہ کہ اس کی قبر پر ایک ایسا مقبرہ تعمیر کرے گا جو رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ ایک دوسری روایت یہ بھی ہے کہ بادشاہ تمام رات ملکہ کے پاس بیٹھا

رہا اور آہستہ آہستہ اس سے باتیں کرتا رہا۔ صبح دم سورج نکلتے ہی ملکہ نے جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔

اس وقت ملکہ کی خاص خدمت گار ستی النساء، ملکہ کے پاس تھی۔ اسی نے ملکہ کے کفن دفن کا انتظام کیا۔ پہلے ممتاز محل کی میت کو برہان پور میں امانتاً دفن کیا گیا۔ کچھ مدت کے بعد اس کی میت سونے کے تابوت میں آگرہ لے جائی گئی۔ اس کی میت کو شاہ جہاں اور ستی النساء کی سربراہی میں آگرہ لایا گیا اور تجہیز و تکفین کے تمام مراحل اسی کی زیرِ نگرانی ادا کیے گئے اور اسے دریائے جمنا کے کنارے ایک عمارت میں دفن کیا گیا۔

ممتاز محل کی وفات کے بعد شاہ جہاں نے اپنے وعدے کے مطابق اور شادی نہیں کی۔ اس لیے حرم کی تمام ذمہ داریاں جہاں آرا بیگم کے سر پر آ پڑیں جو ارجمند بانو کی پہلوٹھی کی بیٹی تھی اور اس کو ماں کی جگہ شاہی حرم میں صدرِ خاندان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ جہاں آرا نے اپنے باپ کی بہت خدمت کی۔ اسے آہستہ آہستہ غم سے باہر نکالا اور دربار میں اپنی والدہ کی قائم مقام کی حیثیت سے بیٹھنا شروع کیا۔

ممتاز محل سے شاہ جہاں کے چودہ بچے پیدا ہوئے جن میں سے نصف زندہ رہے۔ تین شہزادیاں اور چار شہزادے۔ شہزادیوں کے نام یہ تھے۔ جہاں آرا بیگم، روشن آرا بیگم اور گوہر آرا بیگم۔ شہزادوں میں دارا شکوہ، محمد شجاع، محمد مراد بخش اور محمد اورنگ زیب عالمگیر جو ہندوستان کے تاج و تخت کا وارث ہوا اور پچاس سال تک بڑی شان و شوکت سے حکومت کی۔

1632ء میں شاہ جہاں نے اپنی محبوب ملکہ کے ساتھ کیے گئے وعدے کے مطابق اس کیلئے عالی شان مقبرے کی تعمیر شروع کروائی یا یوں کہہ لیجیے کہ اپنی محبت کو خراج تحسین پیش کرنے کیلئے تاج محل کی تعمیر کے کام کا آغاز کیا۔

تقریباً 22 سال تک اس کی تعمیر جاری رہی۔ بیس ہزار کے لگ بھگ معمار اس کی تعمیر میں مصروف رہے۔ ہندوستان، ایران، ترکی سے خصوصی معمار بلائے گئے۔ تاج محل کی عمارت 42 ایکڑ پر تعمیر کی گئی اور تقریباً 32 ملین روپے خرچ ہوئے۔ دریائے جمنا کا جنوب مغربی کنارہ جہاں ممتاز محل کو دفن کیا گیا تھا وہی جگہ اس مقبرے کیلئے منتخب کی گئی۔ دور دراز کے ملکوں سے کاریگر بلائے گئے۔ پہلے اس کا لکڑی کا نمونہ تیار کیا گیا پھر کاریگروں نے اس کے مطابق تعمیر شروع کی۔ تاج محل کا موجودہ منصوبہ کافی بحث کے بعد طے پایا۔

اس کی تعمیر استاد عیسیٰ کی نگرانی میں ہوئی جسے ایک ہزار ہامانہ تنخواہ پر رکھا گیا۔ یہ اعلیٰ تعمیر اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستانی فن تعمیر سے بخوبی واقف تھے۔ یورپ میں رہنے والوں کیلئے اس کا طرزِ تعمیر حیران کن ہے۔ اس کی دلکشی ایسی ہے کہ دیکھنے والا اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسے مسلمانوں کے فن تعمیر کا جھومر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ دنیا کے ورثوں میں بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے۔ یہ بات قابل فخر ہے کہ تاج محل کا پورا ڈھانچہ مسلمانوں کے ہاتھوں تیار ہوا اور پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس کی تزئین و آرائش اور نقش نگاری سبھی کچھ مسلمان فنکاروں کی کوشش اور کاوش کا نتیجہ ہے۔

اس کا طرزِ تعمیر عربی طرز کا ہے۔ اس میں اٹھائیس اقسام کے پتھر استعمال ہوئے ہیں۔ یہ پتھر افغانستان، عرب، سری لنکا، راجستھان، چین، تبت اور پنجاب سے منگوائے گئے۔ اس کا بیرونی ڈھانچہ سفید سنگ مرمر سے بنایا گیا ہے۔ اندورنی عمارت میں مختلف پتھر استعمال ہوئے ہیں۔ امبر (Amber) نیلم (Saphire) وہ پتھر جس پر نقش کھدے ہوں (Comeo)، سرخ بنفشی رنگ کا پتھر (Amethyst)، مرجان (Coral)، بلور (Crystal)، فیروزہ (Turquoise)، قیمتی پتھر (Lapis)، سبز سفید نیلے رنگ کا پتھر (Jade)، سنگ بشپ سرخ اور بادامی پتھر (Jasper)، جیسے قیمتی پتھروں سے اس عمارت کو مزین کیا گیا ہے۔

اس کے اطراف کی دیواروں پر قرآنی آیات اور سورتیں منقش کی گئی ہیں جن سے سجاوٹ کا کام لیا گیا ہے۔ ان آیات کو امانت خان نے منتخب کیا۔ **سورۃ یٰسین، الزمر، الفتح، الملک، المرسلٰت، التکویر، انفطار، النشقاق، الفجر، الشمس، الضحیٰ، الانشراح، التین، النساء، اخلاص** جیسی سورتیں اس کی دیواروں پر کندہ ہیں جن سے مقبرے کی خوبصورتی اور وقار میں اضافہ ہوگیا ہے۔

اسکا بیرونی ڈھانچہ سفید سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی پشت پر دریائے جمنا بہتا ہے۔ اس کے پانی کے عکس کی بدولت تاج محل میں سے بہت سے قوس قزح کے رنگ نکلتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ رنگ دن کے مختلف اوقات میں مختلف دکھتے ہیں جیسے رنگا رنگ نگینے جڑے ہوں۔ چاند کی چاندنی میں تاج محل جگمانے لگتا ہے۔ اسکے پتھروں میں ایسی کشش ہے کہ وہ چاند کی روشنی کو اپنے اندر سمو کر مزید چمکنے لگتا ہے یہ

تاج صبح کے وقت پیازی دکھتا ہے ،شام کے وقت دودھیا اور جب چاند چمک رہا ہو تو اس کی رنگت سنہری دکھائی دیتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دیکھنے کے بعد لوگ کہتے ہیں کہ اسے دیکھنے کے بعد اب کوئی خواہش باقی نہیں رہی۔

اس کی تعمیر کو چار صدیاں بیت چکی ہیں۔ یہ ہر سال لاکھوں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ شاعر ہوں مصور یا پھر موسیقار ہر فن لطیفہ میں اس کی جھلک ضرور ملتی ہے۔ اسے پتھر میں غزل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کی عمارت کی بلندی اس کے ماحول کو پرشکوہ، بارعب اور باوقار بناتی ہے۔ جب تک یہ دنیا میں رہے گا دنیا کے حیرت انگیز عجوبوں میں سے ایک جانا جائے گا اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے یہ تاج محل تعمیر کروا کر جنت کے محلات کی ادنیٰ سی جھلک ہمیں دکھلا دی ہے۔ جنت کے محلوں میں اپنے نیک اعمال کی بدولت ہی داخلہ ممکن ہے ان میں رہنے کیلئے کسی ملک کا بادشاہ ہونا شرط نہیں صرف سچا مسلمان ہونا ضروری ہے۔

☆☆☆

# آؤ ایک بنیں!

کیسے غم ناک دن ہیں اور راتیں! دسمبر ایک بار پھر آنکھوں کو لہو رلا گیا۔ میرے قبیلے کے ایک سردار کو سردار چڑھا دیا گیا۔ با کردار اور باہمت، جری اور بہادر سردار مسکراتے ہوئے اپنے رب کا کلمہ بلند کرنے کے جرم میں پھانسی کے پھندے کو چوم گیا۔ فطری نیند کو کوئی نہیں روک سکتا لیکن آنکھیں بند ہوں یا کھلی بیداری کے عالم میں ان میں ایک ہی منظر سجا رہتا ہے، ایک ہی تصویر سامنے رہتی ہے۔

ڈھاکہ، دسمبر کی یخ رات، رات کا سناٹا، جیل کی دیواریں، کال کوٹھری اور سزائے موت کا قیدی عبد القادر ملاّ! اس کے اور بھی ساتھی اسی جیل میں ارض پاک کی محبت کے جرم میں یوسفؑ کی سنت پوری کر رہے ہیں! قیدی کو آخری سفر پر تیاری کا حکم ملتا ہے اور وہ روانگی سے پہلے عشاء کی نماز کی تیاری کرتا ہے، نیا لباس زیب تن کرتا ہے اور اپنے اس رب کے حضور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے جس سے کچھ دیر بعد اسے ملاقات کرنی ہے، اپنی قربانی پیش کرنی ہے۔

جس رب کی طرف اس نے دن اور رات لوگوں کو دعوت دی، جس رب کے قانون کی سربلندی کے لیے، جس رب کے نظام کی حکمرانی کے لیے اس نے زندگی کے سارے ماہ وسال لگائے، زندگی کی ساری بہاریں خرچ کر دیں۔ صرف عبادت نہیں، صرف سجدے نہیں، صرف اذکار نہیں، اس سے بہت آگے کی وہ چوٹیاں جن کی طرف دیکھ کر بھی دل کانپ جاتا ہے، اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ سر کیں، اقامت دین کی جدوجہد کا اعلیٰ ترین مقام جس کے لیے قرآن کہتا ہے ''وہ قتل ہوتے ہیں...'' سورہ توبہ

سزئے موت کا وہ قیدی جسے تصور کی آنکھ حقیقت کی طرح دیکھ رہی ہے حضرت خبیبؓ کی سی نماز ادا کرتا ہے اور پھر...... پھانسی کے لباس میں تختہ پر چڑھنے کا عمل..... میرا دل یہاں بند ہو جاتا ہے دھڑکنا بھول جاتا ہے۔ میں آپ کے ساتھ چلوں آپ کے ہاتھ چوم لوں! میں آپ کے ایمان کی روشنی سے کوئی کرن لے

لوں! اسے آفتاب کرلوں؟

بنی اسرائیل نے اپنے انبیاء کو قتل کیا، حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ کی مثالیں تاریخ میں واضح ہیں ۔حضرت عیسیٰ کو سولی پر چڑھانے کا اہتمام کیا گیا اور کلمہ گووں نے نبی آخر الزماں ﷺ کی امت کے اولیاء کو پھانسی گھاٹوں پر چڑھایا۔، گولیوں کا نشانہ بنایا۔ .....منظر سارے یکساں ہیں۔صدیوں پہلے یحییٰ کے قتل کی رات بھی ایسی ہی ہوگی؟ سرد، تاریک اور خاموش! ایسے ہی بادشاہ کے سپاہی آئے ہوں گے، تلوار سے گردن تن سے جدا کی ہوگی اور اسی طرح 12 دسمبر کی رات بھی ان کے چاہنے والوں نے آنسوؤں سے مرثیے لکھے ہوں گے! نوحوں کو دعاؤں میں ڈھالا ہوگا اور اپنے بے گنا ساتھی کی نماز جنازہ ادا کی ہوگی! فرید پور کے گاؤں کے تازہ قبرستان میں بنی تازہ قبر اور اس میں رکھا نور سے جگمگاتا چہرہ! عزیزوں اور ساتھیوں کے نالے، بے قراری اور بے تابی! اللہ اکبر! بے شک اللہ سب سے بڑا ہے! اللہ الصمد! بے شک اللہ بے نیاز ہے! اللہ حلیم الشکور! بے شک اللہ اپنے بندوں کا سب سے بڑا قدر دان ہے!!!!

ڈھاکہ، سہلٹ، کھلنا، چٹاگانگ، کیسے پیارے نام تھے! کیسے ہریالے شہر تھے جو اپنے تھے! وہاں کے رہنے والے! ہم ان کے تھے وہ ہمارے تھے، دریاؤں کا پانی، ناریل اور اناناس، خوشبودار چائے کے باغات، املی، پان، کشتیوں میں بنے گھر، سفید اور گلابی پرل ململ کے لمبے کرتے اور خالص کاٹن کی ساڑیاں .....سب خواب ہوگیا، سب ہمارے لیے اجنبی بنا۔ بیت المکرّم مسجد کی اذان کی آواز سے ہمارے کان محروم ہوگئے۔ کیسے طویل خزاں کے موسم آئے، کیسی آندھیاں چلیں، آسیبوں نے گلی کوچوں میں بسیرا کرلیا، کلمہ طیبہ سے جڑے شجر کو دولخت کر دیا گیا۔ خون کی ندیاں بہیں، آگ نے جنگلوں کا حسن کم کر دیا۔ بے گناہی گناہ بنی اور وفا جرم! وفاداریوں پر مقدمے بنائے گئے ۔خود ساختہ بے بنیاد مقدمے، جھوٹی گواہیاں اور شہادتیں! پاکباز اور پاکدامن لوگوں پر اسفل الزام لگائے گئے۔ عدالت سجائی گئی، فیصلہ سنا دیا گیا اور وفا کا مجرم پھانسی کا مستحق ٹھہرا۔

اللہ اپنی الکتاب میں کہتا ہے ''جو لوگ پاک دامن مومن مردوں اور عورتوں پر الزام لگاتے ہیں ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب اور رسوائی ہے۔ جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو اذیت دیتے

ہیں ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ اس دن اللہ لوگوں کو ان کے کیے کا پورا بدلہ دے گا اور ان کے منہ، ہاتھ پاؤں ان کے جھوٹ کی گواہی دیں گے۔" (سورہ النور)

المیہ تو یہ ہے کہ مسلم دنیا کو ٹکڑوں میں کاٹ دیا گیا، بانٹ لیا گیا، جغرافیائی سرحدیں محبتوں کے درمیان فصیل بن گئیں، ایک حصہ سے دوسرے حصہ تک پیغام محبت پہنچنے کے ذریعے بند کر دیے گئے۔ اپنی اپنی فصیلوں میں گھرے اپنی دیواریں چاٹ رہے ہیں۔

لیکن ایمان کے رشتہ سے جڑے نفوس، محبت کی شمع تھامے، اپنے قبیلہ کے شہیدوں، زخمیوں، قیدیوں کے چہرے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ تسلی اور دلاسا، ہمت اور آفریں کے پھول بانٹنا چاہتے ہیں۔

آؤ ہم ساتھ چلیں! آؤ ہم ایک بنیں!

ہماری زندگی، زندگی کے مقاصد ہمارے راستے، ہمارے طریقے ایک ہیں! ہمارے جرم، ہماری سزائیں، ہم پر کیے گئے جبر اور ہماری موت سب ایک جیسی ہیں!

عربی بولو یا انگریزی! زبان اردو ہو یا بنگالی، گورے ہو یا کالے، لمبے قد کے ہو یا چھوٹے! لاالہ کا اقرار کرو گے، لاالہٰ کو زندگی میں اتارو گے، لاالہٰ کی کی بالادستی چاہو گے تو ایسی ہی سزاؤں کے مستحق ٹھہرو گے! یونہی قتل کیے جاؤ گے!

آؤ ہم ساتھ چلیں، آؤ ہم ایک بنیں!

☆☆☆

# ایک زکام سو علاج

ایک انار سو بیمار والا محاورہ تو سنا ہوا ہے ایک زکام سو علاج آج پڑھ رہے ہیں۔ اگر میں آپ سے بصد محبت واحترام بھی عرض کروں کہ حضور آپ بہت جاہل، جلد باز، خود غرض، کم ظرف اور ناشکرے ہیں؟ تو آپ کا ردعمل فوری طور پر کیا ہوگا؟

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب سے ہوش سنبھالی ہے (کچھ کو اعتراض ہے کہ ہائیں ہوش سنبھال لی؟) جب بھی موسم گرما آتا ہے پیاس سے زبان باہر نکلتی ہے، سارا وجود پسینہ بہہ بہہ کر بحر پسینہ بن جاتا ہے تو اکثر و بیشتر ایک فقرہ سننے کو ملتا ہے کہ ''اس دفعہ تو غضب کی گرمی ہے پچھلا پچیس تیس سالہ ریکارڈ ٹوٹ گیا ہے۔''

اور جب سردیاں آتی ہیں نومبر دسمبر تو ''سردیاں آئی نہیں ہیں'' کا سوچ رہے ہوتے ہیں ایک دم کوئٹہ سے برفانی ہوائیں اور پہاڑی علاقوں سے برفباری کا تحفہ ساتھ میں شدید دھند اس کے ساتھ ضروری لوازمے کے طور پر ہوتی ہے، تو ہر ایک کے منہ پر یہی فقرہ ہوتا ہے کہ ''توبہ توبہ کتنی سردی پڑ رہی ہے اس دفعہ، پچھلی دفعہ تو ایسے نہیں سردی تھی۔ پچاس سالہ ریکارڈ ٹوٹ گیا ہے۔'' ساتھ میں ''دھند، اندھا دھند، پالا بڈھیاں دا سالا (پالا، پنجابی لب ولہجے میں سردی کو کہتے ہیں اور بڈھیاں، بوڑھے لوگوں کو۔ سالا...... اردو پنجابی میں ایک سا مفہوم رکھتا ہے اب سمجھنا یا نا سمجھنا آپ کی صوابدید پر ہے، حالانکہ اگر اپنے بچپن سے اب تک یاد کریں موسم گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں سرد ہی ہوتے ہیں بس بات سٹیمنا کی ہے۔ بچپن میں ناسمجھی اور جوانی میں طاقت و ہمت جناتی ہوتی ہے، عمر بڑھتی ہے، حوصلہ اور برداشت کم ہو جاتی ہے۔ ہم پچھلا سال بھول کر شور شرابا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ تو تھی بھلکڑ پنے کا ٹائٹل دینے کی وجہ جو دراصل میں نے نہیں اللہ رب العزت نے دیا۔ اب باقی، خود غرض، جاہل، ناشکرے کو بھی انہی مثالوں پر قیاس کر لیں!!

ہاں تو بات سردیوں کی ہو رہی تھی سردیاں آتی ہیں ڈرائی فروٹس، حلوے، مانڈے اور بیس طرح کی

سوغاتیں لاتی ہیں۔ کہنے کو دن گیارہ گھنٹے کا لیکن گاجر کے حلوے، السی، دالوں،سوجی بیسن کی مٹھائیاں بناتے بناتے ایک سوگیارہ گھنٹے کا لگتاہے۔اب ان چیزوں کے ساتھ موسم اثر دکھاتا ہے اور ایک آدھ دفعہ نزلہ زکام ہونا معمولی بات لگتی ہے۔

اس دفعہ تو جس دن یہ سوچا کہ الحمدللہ اس دفعہ نزلہ وزکام نہیں ہوا بچت ہی رہی اسی شام کو پرانی کتابوں رسالوں کو ترتیب دیتے ہوئے ورق گردانی کرتے ہوئے ایک چھینک آئی۔ پہلے تو ایک ہی آتی ہے بعد میں سلسلہ دراز ہوتا چلا جاتاہے۔سو جناب! رات کو سوتے ہوئے الائچی اور دارچینی کی چائے پی۔خیال تھا کہ رات عالم نیند میں الائچی دارچینی تلے دب جائیں گی۔مگر ایسے نہ ہوا، صبح تو ناک منہ سے پانی...... چھینکیں...... آنکھیں پانی بہہ بہہ کر اور ناک صاف کر کے چھلنی ہو چکا تھا۔

ایک خیرخواہ کا فون آیا۔ السلام علیکم کی بجائے چھینک در چھینک سے وہ سب کچھ بھول گئیں جو کہنا تھا فوراً کہا دارچینی کا قہوہ لو۔لے چکی ہوں رات چائے۔ بولیں چائے؟؟ توبہ توبہ نزلے میں چائے میں دودھ خواہ بقدر اشک بلبل ہی کیوں نہ ہو،بلغم پیدا کرتا ہے قہوہ لو،اگلا فون کر کے پوچھوں گی کہ قہوہ لیا یا نہیں؟؟انہوں نے خیرخواہی میں ہی دھمکی دے ڈالی اب اپنے لیے کون چولہا جائے (حالانکہ برنر آٹومیٹک ہے ماچس جلانے کا وختہ نہیں) کون پین میں پتی ڈالے پھر چولہے پر رکھ کر ڈبے میں سے دارچینی اور الائچی ڈالے پھر کپ میں ڈال کر پیئے۔اوروں کے لئے سوطرح کی سوغاتیں منٹوں میں بنانے والی نے سوچا اور اچھا تھوڑی دیر کے بعد بناتی ہوں کہہ کر کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔اُف پہلی دفعہ پتہ چلا سینے میں سانس کیسے آسانی سے خود بخود آتا جاتا ہے۔اور سیدہ عائشہؓ نے فرمایا تھا کہ بندے پر ہر سانس لینے پر دو نفل شکرانے کے واجب ہیں ایک گندی ہوا باہر لانے پر دوسرا تازہ ہوا اندر جانے پر۔

صورتحال یہ تھی کہ دو تکیے رکھے کہ سانس سوکھا ہوجائے۔مگر حالت یہ تھی کہ دنیا جہان کی گندی ہوا اندر موجود تھی۔ تازہ ہوا اندر تک جانے میں رکاوٹ!! لیٹوں کیسے؟ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ صاحب نے جھٹ سے گرم پانی میں شہد ڈال کر دیا۔ لوگوں کے ٹوٹکوں کو اہمیت دیتی ہو۔میاں کے مشورے پر عمل کر کے دیکھ لو۔میاں صاحب کے مشورے کو

گھونٹ گھونٹ کر کے پیا وقتی طور پر افاقہ ہوا۔ یہ تو آرام سے سو گئے ادھر گھنٹے بعد پھر حالت خراب، نہ بیٹھا جائے نہ لیٹا جائے فوری طور پر اپنی دوست کا جس کے میاں ڈاکٹر ہیں اور وہ خود آدھی ڈاکٹر کا قول یاد آیا۔ ایری نیک فوری نزلے میں ریلیف دیتی ہے۔ الحمدللہ دواؤں والے ریک سے فوراً مل گئی وگرنہ عمر رفتہ کا المیہ ہی یہی ہے کہ جس وقت جس چیز کی ضرورت پڑے وہ اس وقت کبھی نہیں ملتی۔ آزمائش شرط ہے۔

ایری نیک لے کر دو گھنٹے آرام سے گزر گئے یقیناً نیند بھی آئی ہوگی۔ رات کے اڑھائی بجے پھر وہی چھینکیں وہی نزلہ زکام اور وہی سانس کی تنگی۔ بچیوں کے کمرے میں چکر لگایا۔ میاں صاحب کی نیند پر رشک آیا۔ اور کیا کرتی، اچانک ہی احساس ہوا کہ جسم بخار میں پھنک رہا ہے اور بالخصوص دونوں آنکھوں میں تو چولہے جل رہے ہیں۔ بخار کی دوا موجود تھی لیکن سات بجے رات کھانے کے نام پر چائے رس لیے تھے اب تین بج گئے ہیں۔ ہائے ہائے کرتے چھینکوں کے شور میں ڈبل روٹی کا ایک سلائس اور چائے کا ایک کپ لے کر بخار کی دوا لی۔ صبح تک یہ سلسلہ رہا۔

علی الصبح غیر ملک سے سہیلی کا فون آیا۔ ہائے باجی ملٹھی کیوں بھول گئیں، ملٹھی کا قہوہ پئیں۔ اور ابھی پئیں میں گھنٹہ بعد فون کرلوں گی۔ یہ اور بات ہے کہ اگلا ایک تو کیا پانچ گھنٹے فون سننے میں ہی گزرے۔ میری دوست عفت کا فون آیا۔ باجی گلے پر آہستہ آہستہ تیل کی مالش کریں اس سے بڑا سکون ملتا ہے۔ (زور زور سے کریں گی تو گلا دب کر ہمیشگی کا سکون ملتا ہے پر یہ کون بتائے کہ اپنے ہاتھوں سے گلے دبانے والا شہید نہیں ہوتا) اور ہاں انہوں نے ہدایات جاری رکھیں بڑے کہتے ہیں مونگ کی دال بہت اچھی ہوتی ہے فلو میں اور ناک اور ناف پر تیل ضرور لگائیں ورنہ ناک پک جاتا ہے۔ پڑھا ہے کہ ہر اہم بات رسولؐ اللہ تین دفعہ کہتے تھے۔ عفت ان کی پکی پیروکار ہے۔ اس نے تین دفعہ بات کہہ کر فون بند کر دیا۔ خیر سے بڑی بیٹی (میڈیکل کی طالبہ) کا فون آیا۔ السلام علیکم کے بعد پوچھنے لگی۔ امی نزلہ ہوا ہے؟ کیا لیا، میں نے ایری نیک کا بتایا تو بولی اوہو ساتھ میں پیناڈول بھی لیں ایری نیک اکیلی کیا کرے گی۔

چلیں جی عفت کی فرمائش پوری تو نہ ہوئی 1/3 کی کہ فوراً گلے پر تیل ملا اور ایری نیک کے ساتھ پیناڈول لے کر لیٹ گئی۔ اگلے دو گھنٹوں میں زبانی کلامی (فون

پر) آمنے سامنے ملاقات کرنے والیوں نے رنگا رنگ مشورے دیئے۔

دیسی مرغ کی یخنی تین دفعہ پئیں ساتھ میں سوپ بھی بنوالیں۔

چائے میں دارچینی، چھوٹی الائچی کے ہمراہ لونگ ضرور ڈالا کریں۔ سردی کے زکام کا تیر بہدف نسخہ ہے۔ تیر کی اور لونگ کی شکل ملتی ہے یاد رکھیے گا۔

عامرہ نے کمال مہربانی سے کہا باجی میری کھانسی منقیٰ سے ٹھیک ہوتی ہے۔ اس کی بھی حالت کئی دن سے خراب تھی اس کو اللہ نے منقیٰ کے ذریعہ شفا دی میں نے پوچھا منقیٰ کلاں یا خورد۔ حکمت گھٹی میں پڑی تھی پوچھ بیٹھی۔ اس نے تھوڑی دیر میں منقیٰ ہی بھجوا دیا۔ جھٹ پٹ اس کے کئی دانے منہ میں ڈال لیے۔

باجی خورشید نے بھی بی دانہ اور گاجر کا مربعہ چالیس ہدایات کے ہمراہ ارسال کیا۔ چونکہ میری امی بی دانہ کی معترف تھیں لہٰذا فوراً اس کے بھی چند دانے منہ میں ڈال لیے۔

ارے چھوڑو بی دانے اور لونگوں کے تیر کو، آسان سا نسخہ ہے دودھ ابال کر کچا انڈا مکس کرو اور پھینٹ کر پی جاؤ ایک حکم آیا۔

مرد کہاں پیچھے رہتے ہیں۔ ارے آپ نے شہد میں پھٹکڑی ڈال کر لینا تھا۔ دوسرے قریبی عزیز کہنے لگے ہم تو کالی مرچ پسی ہوئی ہمیشہ گھر میں رکھتے ہیں جونہی فلو ہوا ایک چمچ شہد اور ایک چٹکی کالی مرچ پسی ہوئی ملا کر لیں۔ نزلہ فشوں۔ انہوں نے ٹی وی کے اشتہار کو فالو کیا۔ ایک ہمسائی مشورہ لے کر آئیں۔ اف تمہیں نہیں پتہ جتنا بھی شدید نزلہ ہو شہد میں ادرک کا رس ڈال کر پئیں تو ستر سالہ نزلہ زکام بھی ختم ہو جاتا ہے۔

مشورے مشورے مشورے۔ ہر وقت منہ میں بجائے اللہ کے ذکر اذکار کے لونگ الائچی، منقیٰ، شہد ہوتا۔ چولہے پر پانی ابلتا موجود رہتا۔ جس کے چند گھونٹ نکال کر کبھی شہد کبھی چائے بنا کر پی جاتی۔ چائے کا کپ دیکھنے والا غوطہ ہی کھا جائے گرم مصالحے کا آدھا ڈبہ چائے کے کپ میں موجود ہوتا ہے۔ چھوٹی الائچی، بڑی الائچی کے چند دانے، لونگ، دارچینی۔ اور ہاں چائے میں لیموں کا قطرہ بھی ڈال لیا کرو۔ گلا صاف رہتا ہے۔ غوطہ کھا کر باہر آنے والی ہمسائی نے کہا۔

''ٹھیک ہے جناب!'' اپنی حالت یہ تھی کہ ان

سب کے استعمال سے نزلے زکام کو تو کیا فائدہ ہوتا الٹا منہ میں چھالے بن گئے۔ زبان کناروں سے پھول گئی۔ بولنے کی کوشش میں زخمی ہو جاتی۔ باجی فرحت کا فون آیا تو میں رو ہی پڑی۔ باجی ایسا نزلہ تو مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ پچھلے سال بھی ایسے ہی ہوا تھا۔ بہت حالت خراب تھی تمہاری، ٹانگوں میں درد ہو گیا تھا۔ ہفتہ بھر تو بخار بھی نہیں اترا تھا۔ انہوں نے میری درستی کی۔

میرے ذہن میں کوندا سا لپکا، بھلکڑ، قانتہ بھلکڑ۔ رب بھی تو انسان کو ''انسان'' بھلکڑ پنے کی وجہ سے ہی کہتا ہے تکلیف معافی تلافی کا آنسو جب تک آنکھ سے نہ نکلا دل کو بے سکونی رہی۔

تیسری رات ساری ہی تکلیف اور جاگنے کی تھی۔ درمیان میں دیسی انڈے کو ابال کر کھانے کا بھی شرف حاصل ہوا کہ ایک خیر خواہ بنفس نفیس مشورہ دینے آئی تھیں۔ یہاں تک کہ تھک ہار کر کے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔ بخار اور اس کے اثرات نے سارے وجود میں درد ہی درد بھر دیا تھا۔

ڈاکٹر نے فوری انجکشن لگوائے کف سیرپ اور ادویات کا لمبا چوڑا نسخہ دیا۔ رات کو سوتے وقت یہ گولی لے لیں۔ انہوں نے ویلیم لکھ کر ٹک مارک کیا۔

لیجیے جناب! اس نیند کی گولی نے ہم پر بھی رات آسان کر دی۔ ساری رات آنکھ کھلتی رہی بند ہوتی رہی، ہاں نیند بڑی نعمت ہے یہ حالت کی خرابی کی وجہ بھی تین راتوں سے مسلسل نیند نہ آنا تھا۔ نیند پوری نہ ہو گی تو بیماری جلد حملہ کرے گی۔ اللہ کی نعمتوں میں سے نیند بڑی نعمت ہے۔ سو صبح اٹھ کر نماز سے پہلے ایک سجدہ شکر بھی ادا کیا۔ اب دعا ہے کہ جلد ہی دوسرا سجدہ شکر ادا کر لیں کہ صحت اور تندرستی بھی ہزار نعمت ہے کہ مومن ضعیف سے مومن قوی زیادہ اچھا ہوتا ہے۔

☆☆☆

# دو خط

یکم مارچ ۱۹۷۴ء

پیارے دوست جاوید

السلام علیکم!

امید ہے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے تم اورتمہارے اہل خانہ بعافیت ہوں گے۔ الحمدللہ ہمارے ہاں بھی ہر طرح سے خیریت ہے۔ دوست! جیسا کہ تم جانتے ہوں کہ چند دن تک میٹرک کے امتحان شروع ہورہے ہیں۔ آج کل تو زیادہ وقت پڑھائی میں گزرتا ہے۔ بوریت بھی ہوتی ہے مگر میں محنت کررہاہوں تاکہ اچھے نمبر لے کر اپنے ماں باپ کے خوابوں کو پورا کرسکوں۔

جب میں اپنے والدین کو اپنے لیے محنت کرتے اور قربانیاں دیتے دیکھتا ہوں جو مجھے بہترین تعلیم وتربیت سے آراستہ کرنے کے لئے دے رہے ہیں، تو میں یہ عزم کرتا ہوں کہ ان کی قربانیوں کو رائیگاں نہیں جانے دوں گا۔وہ مجھے ایک باعمل مسلمان،مفید شہری اورکامیاب انسان دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ ان کی توقعات پر پورا اتر سکوں۔

میں نے پڑھائی کا ٹائم ٹیبل بنایا ہوا ہے تاکہ وقت ضائع نہ ہو۔ گو اسکول میں امتحان کی تیاری کے لئے چھٹیاں ہوگئی ہیں لیکن ہمارے اساتذہ نے اجازت دی ہوئی ہے کہ ہم جب تک چاہیں اسکول آکر ان کی مدد لے سکتے ہیں۔ جبکہ حساب کے استاد اپنے گھر پر ہمیں تیاری کرواتے ہیں۔ درحقیقت انہی مہربان والدین اور پُرشفقت اساتذہ کی بھرپور توجہ سے ہم اس قابل ہوتے ہیں کہ معاشرے میں سر اٹھا کر چل سکیں۔ ہماری کامیابیوں کا سہرا انہی کے سر جاتا ہے۔

امتحانات سے فراغت کے بعد میری خواہش ہے کہ تم چند دن میرے ہاں آؤ اور ہم مل کر کسی تفریحی سفر پر چلیں۔ میں نے کچھ نئے ناول بھی خرید کر رکھے ہوئے ہیں تاکہ امتحانات کے بعد پڑھ سکوں۔ تمہیں کوئی اچھا لگے تو پڑھنے کے لئے لے لینا۔

اپنے والدین کو میری طرف سے مؤدبانہ سلام عرض کرنا۔ چھوٹے طاہر کو پیار۔

والسلام

تمہارا دوست

عبداللہ

☆......☆......☆

یکم مارچ ۲۰۱۴ء (ای میل)

ہائے جے ڈی!

کیسا ہے جگر! کل کہاں غائب تھا۔ کہیں امتحانوں کی فکر تو سر پر سوار نہیں کر لی۔ Chill یار۔ کل اتنی آفت مووی آئی ہوئی تھی۔ تو ہوتا تو انجوائے کرتا۔

پتہ ہے، میرے ڈیڈی دبئ سے میرے لیے بڑا فِٹ آئی فون لائے ہیں۔ ہاں ہاں یار۔ امتحان جو ہونے والے ہیں، اس کی تیاری ہے۔ اب وہ پرانے زمانے تھوڑی ہیں کہ بوٹیاں لے کر جاؤ۔ اب تو ٹیکنالوجی کی بہاریں ہیں۔

اسکول تو بند ہیں۔ 15 دن بعد امتحان جو ہیں۔ سچی یہ نیٹ اور موبائل نہ ہوتا تو بڑی بوریت ہوتی۔ اب رات تو مزے سے گزر جاتی ہے۔ دوپہر کو ڈھائی تین بجے اٹھتا ہوں۔ پانچ بجے اکیڈمی جاتا ہوں۔ پیسے تو بہت لے رہے ہیں مگر گارنٹی دیتے ہیں کہ 90% نمبر آجائیں گے۔ پر اپن کو کیا فکر۔ ڈیڈی نے سب معاملہ سیٹ کر لیا ہے۔ ہنستے کھیلتے جائیں گے اور پیپر دے آئیں گے۔

ویسے یہ پڑھائی ہے بالکل بکواس چیز۔ میں تو ڈیڈی سے کہتا ہوں کہ پیسہ پھینکیں اور ڈگری خرید لیں۔ ختم۔ اب ہم کوئی جاہل تو ہیں نہیں۔ کمپیوٹر تک تو آپریٹ کر لیتے ہیں۔ یہ ڈگری شگری بھی نرے چونچلے ہیں۔ لیکن ڈیڈی چاہتے ہیں کہ میں کسی ''کماؤ'' محکمے میں پہنچ جاؤں تاکہ انہوں نے جتنا مجھ پر لگایا ہے، سب وصول ہو جائے۔ ڈیم اِٹ یار۔

سچ یاد آیا۔ اسد نئی کمپیوٹر گیمز لایا ہے۔ بڑی تباہی گیمیں ہیں۔ ٹھائیں ٹھائیں ٹھشوں ٹھا۔ خوب مار دھاڑ ہے۔ قسم سے مزا آجاتا ہے۔ اگر کل تو بھی آجا تو اس کی طرف چلتے ہیں۔ کچھ شغل میلہ ہی رہے گا۔ نہیں یار! امی کو کیا پتہ۔ کل ویسے بھی انہوں نے پارلر جانا ہے۔ دو ڈھائی گھنٹے تو کہیں نہیں گئے۔ ٹھیک ہے یار، کل میں تیرا انتظار کروں گا۔

بائے

ایڈی

☆☆☆

# سرِ راہ

سانجھے کی ہانڈی چوارہے پر پھوٹتی تو سنا تھا...... جہاں بے اعتباری معاملات میں در آئی...... سارا حساب بے باق کر دیا گیا...... یہ تیرا یہ میرا، ایسی کی تیسی...... جاؤ میری طرف سے......آئندہ شکل نہ دکھانا! لیکن برا ہوا اس بے اعتباری کا جو شراکت کے کاروبار تک ہی محدود نہیں رہی گلشن کے کاروبار تک جا پہنچی۔

کوئی غلط فہمی! کوئی گمان! کوئی افواہ کوئی اتفاق ایک اٹوٹ بندھن کے اندر بھی بے اعتباری گھول دیتا ہے اور برسوں کا بنا بنایا مضبوط اور پائیدار بندھن ایک چھناکے سے یکا یک یوں ٹوت جاتا ہے جیسے پانی کا گلاس ہاتھ سے یکا یک چھوٹتا اور ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا ہے۔ آپکا منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے کہ ارے یہ کیسے ہوا؟ ہر چند کہ گلاس کے ٹوٹنے پر بھی آپ کو افسوس ہوتا ہے لیکن آپ جانتے ہیں ایک ٹوٹا تو دوسرا نکال لیں گے۔ دوسرا بھی ٹوٹ گیا تو نیا سیٹ خرید لائیں گے۔ لیکن آپکو یہ خبر یقیناً چونکا گئی ہوگی جب آپ نے چوارہے پر میاں بیوی کو لڑتے سنتا ہوگا۔ اور لڑائی بھی ایسی کہ کلائی میں چوڑی نہیں ٹوٹی...... سانس کی ڈوری ٹوٹ گئی! آ گیا عین لڑائی میں وقت قضا...... قضا آ جائے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ رینجرز اہلکار تو امن کے قیام میں آپکی مدد کیلئے تعینات کئے گئے ہیں۔ وہ چھینا جھپٹی کے واردات نہ سہی میں میاں بیوی کے تنازعات تو ہمیشہ کیلئے ختم کر سکتے ہیں وہ خاتون جو ابھی ابھی بیوی تھیں یکا یک بیوہ ہو گئیں۔ بات دکھ کی بھی ہے، غم کی بھی ہے اور فکر کی بھی......

بھلا چوراہے پر اس گھمسان کے رن کی کیا ضرورت تھی؟ جنگ بھی ایسی کہ دیکھنے والے کو اس پر دہشت گردی کا گمان گزرا اور وہ گولی جو کسی مفرور قاتل پر چلائی جانے والی تھی وہ کسی اور سر پر چل گئی۔ خوش باش جوڑے لڑائی جھگڑے کو خوشگوار زندگی کیلئے ضروری اور اہم خیال کرتے ہیں کیونکہ اس جھگڑے فساد کے بعد مک مکا ہو جاتا ہے۔ گاڑی پھر پٹری پر چلنے لگتی ہے۔ پھر کبھی تبدیلی آب و ہوا کے لئے گرما گرمی شروع

ہوجاتی ہے اور اس چھڑکاؤ کے بعد مطلع پھر سے صاف ہوجاتا ہے۔ پس دیوار زنداں ہی مذاکرات طے پاجاتے ہیں۔گھر سے باہر بلکہ دیوار سے باہر بات نہیں نکلتی۔ساری عمر یونہی سلگتے، الجھتے، بگڑتے پکڑے اور ٹالتے گزر جاتی ہے جسے عرف عام میں نبھ جانا کہتے ہیں۔کبھی سڑک پر کھڑے ہوکر کھانا، سڑک پر کھڑے ہوکر کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا، سڑک پر کھڑے ہوکر گھورنا، سب نازیبا حرکتیں سمجھی جاتی تھیں۔

اس قدر چھان پھٹک کر ناپ تول کر کسی لڑکی کا انتخاب کیا جاتا ہے اور گھر لاتے ہی اس کی حرکت کو مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ نہ اسکا ہنسنا بھاتا ہے، نہ پہننا، نہ اسکے ہاتھوں کا پکا اچھا لگتا ہے نہ اسکی دلچسپی اور شوق کو سراہا جاتا ہے......گھر کے سارے افراد اس ایک ہستی کو ٹارگٹ کر لیتے ہیں......حالانکہ ہمارے یہاں جوائنٹ فیملی سسٹم پایا جاتا ہے مگر ایسے موقعوں پر جب بات بگڑنے لگتی ہے تو نہ بڑے سمجھانے الجھانے، معاملے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہیں نہ چھوٹے اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔بس مخالفت کی ایک روش چل پڑتی ہے اور ہر کوئی اپنا اپنا حصہ ڈالنے لگتا ہے چنانچہ یہ گاڑی اگلے اسٹیشن سے پہلے ہی حادثے کا شکار ہوجاتی ہے۔

☆☆☆

آسیہ راشد

# محترمہ نجمہ یاسمین یوسف سے ایک ملاقات

بتول کے صفحات کی زینت بننے والا شعروسخن کی دنیا کا جانا پہچانا نام محترمہ نجمہ یاسمین یوسف صاحبہ کا ہے۔ آپ خوش مزاج، خوش رو، خوش سخن خوش الحان شاعرہ ہیں۔ اہل زبان کی شیرینی اور حلاوت ان کی گفتگو میں رچی بسی ہے۔ بات شروع کرتی ہیں تو سامع بے اختیار ان کی گفتگو میں کھو جاتا ہے۔ وہ اپنے عہد اور روایات کی بہترین وکیل ہیں۔ بہت سلیقے سے اپنی بات دوسری تک پہچانے کا فن جانتی ہیں۔ فکر وفن کے اسی ملاپ نے ان کی شاعری کو رنگارنگ گلدستے کی صورت میں یکجا کر دیا ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں عشق محمدیؐ، نسائی روایات، محسوسات ومحرکات، جذبات، اصلاح پسندی، نیک نیتی اور دین سے گہری وابستگی نمایاں ہے۔ آپ کا تعلق ''بدایوں'' کے مردم خیز خطہ سے ہے۔ شاعری کے چار مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پانچواں زیر طبع ہے۔ بے شمار مشاعروں میں حصہ لیا، بے تحاشا داد پائی۔ شاعری کے حوالے سے جیو ٹی وی پر انٹرویو بھی نشر ہو چکا ہے۔ آئیے نجمہ یاسمین یوسف صاحبہ سے ملتے ہیں۔

س۔ اپنا سن پیدائش اور خاندانی پس منظر بتائیں؟

ج۔ جب میں اپنی آنکھیں بند کرتی ہوں تو مجھے بہت دور تک دکھائی دیتا ہے۔ میں جہاں دیکھ رہی ہوں وہ 1940ء کا سال ہے جب میری والدہ لاہور آئیں۔ مجھے ''لاہوریا'' کہلوانے کا شوق تھا جبھی تو میں دو ماہ پہلے ہی والدہ کی گود میں آ گئی۔ میرے لیے یہ بات باعثِ افتخار ہے کہ میرا تعلق ہندوستان کے ضلع یوپی کے شہر ''بدایوں'' سے ہے۔ یہ شہر اپنے گردونواح کی خوبصورتی، نفاست اور اپنے شہریوں کی متانت وشرافت کی وجہ سے کبھی گمنام نہیں رہا۔ یہی وہ حقیر شہر ہے جہاں حضرت نظام الدین اولیاء جیسے عظیم المرتبت صوفی اور ولی پیدا ہوئے۔ بدایوں میں بڑے بڑے اہل فکروفن نے جنم لیا اور علم وادب کو اپنا فرض سمجھا۔ رشید احمد صدیقی نے ''گنج ہائے گرانمایاں'' میں شمس العلماء سید محفوظ بدایونی کے بارے میں لکھنے سے

پہلے ''بدایوں'' کومردم خیز خطے کے نام نامی سے یاد کیا ہے اوراس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ بے شمار نام ستاروں کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں، فانی بدایونی، شکیل بدایونی، محشر بدایونی، منور بدایونی، دلاور فگار، ابواللیث صدیقی، اداجعفری، درانجم عارف، شہناز مزمل، زہرہ نگاہ، انورمقصود، فاطمہ ثریا بجیا، آل احمد رضوی اور علی مقصوداوران کے اہل خانہ کاتعلق بدایوں سے ہے۔

میرے والد مقصودعلی مرحوم بدایوں کے مقتدر شرفاء میں سے تھے۔انہوں نے ادیب عالم، منشی فاضل سبھی امتحان پاس کرر کھے تھےاوروکالت کے پیشے سے منسلک تھے۔ آپ شاعر بھی تھے ان کا زیادہ تر کلام فارسی میں تھا جس کوانہوں نے یکجا بھی کرلیا تھامگروقت نے مہلت نہ دی۔ پاکستان ہجرت کے وقت خالی ہاتھ آنا پڑا۔جب تک چادراور چاردیواری کا بندوبست ہوتا وہ دارِفانی سے کوچ کر گئے۔سید آل احمد رضوی میرے چچازاد بھائی ہیں انہوں نے عہدِ حاضر کی مسلمان نوجوان نسل کی اس طرح نمائندگی کی ہے کہ اسلامی موضوعات پرمتعدد کتابیں لکھیں جن میں سے ادعیانِ عالم میں تذکرہ خیر الانام بڑے بڑے دانشوروں اوراہل علم سے تحسین پاچکی ہیں۔ میرے نانا قاضی حب حسن کا گورنمنٹ آف برطانیہ میں عمل دخل تھا۔ گورنر کے کہنے پرمشیر کے طور پرمسائل کے حل کیلئے بلائے جاتے تھے۔ان کاتعلق سرسیداحمدخان کے سکول آف تھاٹ سے تھا۔

جن دنوں انقلابِ روس برپاہوا ان دنوں بہت سے مسلمانوں کووہاں سے نکال دیا گیااس زمانے میں بہت سے مسلمان روس سے ہندوستان پہنچے۔ان میں میری نانی کا خاندان بھی تھایعنی میری نانی کاتعلق روس سے تھا۔ان کا نام یاقوت تھا وہ یاقوت کی طرح چمکتی دمکتی تھیں۔ان کے بڑے اعلیٰ عہدوں پرمتمکن تھے انہوں نے 1857ء کے غدر میں حصہ لیا جس کی پاداش میں بہت سوں کوآدھازمین میں گاڑ دیا گیا۔میرے دادا کا کوئی سماجی کردار نہیں تھا۔صرف ترکی کے ریولیشن سے تھا۔شمس العلماء سید محفوظ علی بدایونی ہمارے عزیز تھےان کی لکڑنواسی میرے بہو ہے۔

س۔آپ کے گھر کاماحول کیسا تھا؟

ج۔تخیّل میں میں اپنے آپ کوموروثی گھر کے بڑے دالان میں درودیوار سے لپٹے گلاب اورموتیے کے گجروں کی مہکتی فضا میں پاتی ہوں۔فرش پرسفید براق چادریں، گلاب کے پھولوں سے سجے گلدان

اور چوکی پر دوزانو مودب بیٹھے گھر کے معتبر اور خوش الحان افراد میلا داقدس شریف پڑھتے ہوئے ایسے لگتے ہیں جیسے تقدیس وتقویم کے مجسمے ہوں۔ایک دوسرا منظر ہے جس میں گھر کی ڈیوڑھی ہے جس میں بزاز ساڑھیاں اور جوتے لے کرآتے ہیں۔خاتون خانہ وہیں دیکھتیں، پسند کرتیں اور خرید لیتیں۔ ہمارے بہت سے افرادِ خانہ تھے جن میں میری بیوہ پھوپھی بھی اپنے بچوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ بڑے بڑے دالان تھے باورچی خانہ رہائشی حصے سے دور تھا۔مشترکہ خاندانی نظام تھا جس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ نااتفاقی کو بچوں تک پہنچنے نہیں دیتے تھے۔ بچے آپس میں لڑتے تو بڑے صلح کروا دیتے۔ ہم نے اپنے ماحول سے رواداری، صبر وتحمل سیکھا۔ یہ خوبیاں اسی ماحول کی بنا پر ہم میں آتی چلی گئیں۔آج کل تو صرف ہیلو ہائے رہ گئی ہے ہماری بچپن کی یادیں ہمارا سرمایہ ہیں جنہیں یاد کرکے ہم خوش ہوتے ہیں۔ ہمارے بچے اس نعمت سے محروم رہ گئے ہیں۔ہم نے انہیں خوشگوار یادیں نہیں دیں اس لیے وہ تنہا ہیں۔ میرے والد اور والدہ دنوں پراثر شخصیت تھے ہم نے شعوری یا غیر شعوری طور پران کا اثر قبول کیا۔آج کل تہذیب وروایات کے پیمانے بدل گئے ہیں۔اس دور میں جن گھرانوں میں کتابیں ہوتی تھیں وہ باعزت گھرانوں میں شمار ہوتے تھے قالینوں،صوفوں اورفانوسوں والے گھر اوچھے گھر کہلاتے تھے آج کل سب الٹ ہوگیا ہے۔

س۔اپنے بچپن کا کوئی یادگار واقعہ سنائیں؟

ج۔میرے بچپن کا یہ واقعہ میری شہرت کا سبب بنا۔ بدایوں میں ہمارا گھر اونچائی پر تھا۔ ان دنوں گھروں میں کنویں ہوتے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا،سب بڑے بزرگ دالانوں میں چلے گئے۔ہم بچے اکٹھے کھیل رہے تھے۔کسی بچے نے تجویز دی کہ جو بچہ چھلانگ لگا کر کنویں کو پار کرے گا وہ ایک ہفتہ تک تمام بچوں پر حکومت کرے گا۔ یہ سننا تھا کہ میں گردن پھلا کر بھاگی اور چھلانگ لگادی۔کنویں کے پار تو نہ جاسکی بلکہ کنویں میں گرگئی۔کنویں میں بہت کم پانی تھا۔اب جو میرا حال ہوا ہوگا وہ آپ سمجھ سکتے ہیں۔تمام بچے ڈر کر چھپ گئے۔ اتفاق سے میری بہن نے کمرے کی کھڑی سے مجھے کنویں میں گرتے دیکھ لیا وہ اس قدر خوفزدہ ہوئیں کہ ان کی آواز حلق میں پھنس گئی وہ بار بار جا کر بڑوں کو بتانے کی کوشش کرتیں مگر خوف اور صدمے کی وجہ سے بول نہیں پارہی تھیں آخرانہوں نے

اشارے سے بتایا کہ میں کنویں میں گرگئی ہوں۔ گھر والوں نے کنویں میں جھانکا تو میں نے کہا ''ماں میں زندہ ہوں'' اندر سے باہر تک لوگ ہی لوگ تھے۔ ہر طرح کے کام کرنے والے پورا محلّہ اکٹھا ہوگیا تھا۔

اللہ دتا نے کہا میں کنویں میں اتروں گا۔ اس نے پیڑھی لے کر رسی سے باندھی اسے لوگوں نے کنویں میں اتارا۔ کنویں کا آدھا قطر خالی ہوتا ہے آدھے میں پانی ہوتا ہے۔ میں خالی حصے پر گری تھی اس لیے چکنا چور تھی۔ اس نے جب مجھے پیڑھی سے باندھا تو میں نے کہا اللہ دتا میری ٹانگ وہیں رہ گئی۔ اس نے کہا فکر نہ کرو ٹانگ موجود ہے۔ جب مجھے باہر نکالا گیا تو والد نے مجھے گود میں لے لیا میں نے کہا میں آئندہ آپ کا ہر کہا مانوں گی یہ کہہ کر میں بے ہوش ہوگئی۔ جب ہوش آیا تو پلستر چڑھا ہوا تھا۔ میری ماں نے بہت محنت سے میری دیکھ بھال کی۔ ان کی بھرپور توجہ اور محبت کی وجہ سے چلنے پھرنے کے قابل ہوئی۔ آج میں اپنی ماں کی وجہ سے زندہ ہوں جنہوں نے دن رات میری خدمت کی تبھی میں صحت وسلامتی کے ساتھ آپ کے سامنے موجود ہوں۔ انہوں نے میرے لئے بہت صدقہ وخیرات کیا۔ دیگیں پکا کر بانٹیں۔ جب میں کنویں میں گری تو میں نے عہد کیا کہ غرور اور کنویں کے پاس نہیں جاؤں گی۔

س۔ آپ جب ہجرت کر کے پاکستان آئیں تب کا کوئی احوال سنائیں؟

ج۔ میرے بچپن کی یادوں میں پھول، تتلی اور جگنو کی بجائے دھواں ،آگ اور چنگاریاں زیادہ ہیں۔ آج سے نصف صدی پہلے رات کے دس بجنے کو آدھی رات کہا جاتا تھا۔ ایسی ہر رات کو شر پسندوں کا غول شراب میں دھت جلتی مشعلیں پکڑے کنستروں میں مٹی کا تیل بھرے شور مچاتے ،آگ لگاتے، للکارتے اور دندناتے پھرتے تھے، ہمارے گھر میں ہر روز رات کو لوہے کی بڑی پیٹی میں سے تلواریں، بلم، بندوقیں اور اسی قسم کے دوسرے ہتھیار نکالے جاتے اور گھر کے مردوں کے علاوہ بہوؤں، بیٹیوں سمیت سارے گھر والوں کو پکڑا دیئے جاتے۔ ان میں ہم جیسے چھوٹے اور ناسمجھ بچے بھی شامل تھے کہ ان خبیث آوازوں سے ڈر کر رونے کی بجائے ہم اپنے اپنے نقلی چھری چاقو تیز کرنے لگتے تاکہ جلد سے جلد پاکستان لے سکیں۔ پاکستان ہم بچوں کے خوابوں کا وہ پرستان تھا جہاں نہ گھر جلتے تھے نہ ہی لاشے اٹھتے تھے۔ مگر ایک

رات اعلان ہوا کہ اگر کسی مسلمان کے گھر سے سبزی، ترکاری کاٹنے کے علاوہ کوئی ہتھیار دورانِ تلاشی ملا تو مسلمانوں سے جیلیں بھر دی جائیں گی۔ سب نے اپنے ہتھیاروں کو گھروں کے پچھواڑے میں پھینک دیا۔ پھر ایک خونچکاں معرکے کے بعد آنسو بھری آنکھیں لئے ننگے سر ننگے پاؤں میرے بابا پاکستان کی سرزمین پر سربسجود ہوکر ارض پاک کو بوسہ دے رہے تھے۔ میں ان کے ساتھ سجدہ ریز تھی۔ میرے بھائی مظفر صدیقی صاحب نے قیامِ پاکستان کی صعوبتوں کو جس طرح مردانہ وار جھیلا اور جس خلوص اور بے غرضی سے نہ صرف آنے والے مسلمانوں کی بلکہ جانے والے ہندوؤں اور سکھوں کے خاندانوں کی خدمت کی وہ ایک الگ داستان ہے۔ انہوں نے ہر طرح سے آنے والوں کا خیر مقدم کیا۔ ان کی معاونت کی۔ جانے والوں کو اپنی جیب سے خرچ کر کے بارڈر پار کروایا۔ اس کے اعتراف میں ایک خط بھی آیا جس میں لکھا تھا ''مسلمان کی تعریف کتابوں میں پڑھی تھی مگر اس کا مسلمان کو آپ کے اندر پوری توانائی اور دیانت کے ساتھ پایا۔ آپ خود لٹ کر یہاں آئے لیکن آپ نے ہمیں لٹنے نہ دیا۔'' مگر اس کیا علاج ہے کہ آج ہم خود اپنے آپ کو لوٹ رہے ہیں۔ ہر آنے والا دن ہمیں کمزور سے کمزور کر رہا ہے۔

س۔ آپ کے کتنے بہن بھائی ہیں؟

ج۔ ہم دو بھائی اور پانچ بہنیں ہیں۔ شعری ذوق ہمارے خاندان کی میراث ہے۔ ہمارے گھر میں شعری نشستیں ہوتی تھیں۔ والد صدارت کرتے بچوں سے اشعار وزن درست کرنے کے لئے پڑھوائے جاتے۔ میری ہمشیرگان سیدہ سرفراز فاطمہ، ریاض فاطمہ، اعجاز فاطمہ، ڈاکٹر اسما خاتون حجاب تخلص کرتی تھیں۔ بہت پر گو شاعرہ تھیں اور بھائی منظر احمد صدیقی اور منظور حمیدی نہ صرف شعر وسخن کا اعلیٰ ذوق رکھتے بلکہ منظور حمید نوشہرہ کی ادبی محفلوں کی رونق سمجھے جاتے۔

س۔ دوران تعلیم آپ کس شخصیت سے متاثر ہوئیں؟

ج۔ وہ میری استاد مس رحمان تھیں جنہیں میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ میں نے اسلامیہ گرلز ہائی سکول گوالمنڈی سے پڑھا ہے۔ یہاں کی پرنسپل ہیڈ مسٹریس مس بھٹی کا تعلق امرتسر سے تھا۔ بہت خالص لوگ تھے۔ وہ نسلوں کو پروان چڑھانے والے لوگ تھے۔ میرے والدین نے فساد کی وجہ سے مجھے سکول نہ بھیجا

۔آٹھ سال کی عمر میں مجھے پانچویں جماعت میں داخلہ مل گیا۔ میری کلاس کی لڑکیوں نے میرے داخلے پر بہت اعتراض کیا۔انہوں نے کہا اگر یہ پانچویں میں جائے گی تو ہم دسویں میں جائیں گے۔انہوں نے میرا بستہ کلاس سے باہر پھینک دیا۔مس رحمان نے مجھے اپنے پاس کرسی پر بٹھایا،لڑکیوں کی پٹائی کی،میرا حوصلہ بڑھایا۔ میرا صبروتحمل میری گھریلو تربیت کا نتیجہ تھا۔ سکول سے ہم نے بہت کچھ سیکھا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ بندوق چلانا اور ریڈکراس کی ٹریننگ بھی حاصل کی یہی تربیت شادی کے بعد کام آئی۔

س۔اپنی شادی کے بارے میں بتایئے اور آپ کی ازدواجی زندگی کیسی گزری؟

ج۔1955ء میں میری شادی ہوگئی۔اس وقت میری عمر پندرہ برس تھی میٹرک کا نتیجہ بعد میں آیا۔جن دنوں شادی ہوئی ان دنوں ہم لٹ پٹ کر پاکستان آئے تھے۔ایک کمرے کے گھر میں رہتے تھے بہت سادگی سے تقریب منعقد ہوئی۔میری شادی شمس العلماء مولوی ممتاز علی کے خاندان میں ہوئی۔مرحوم میرے خسر سید سردار علی مرحوم کے رشتے میں ماموں ہوتے ہیں ان کی اہلیہ سیدہ محمدی بیگم نے تقسیم ہند سے پہلے مسلم خواتین کیلئے اردو کا پہلا رسالہ ’’تہذیب نسواں‘‘ کے نام سے جاری کیا۔اس کے علاوہ بچوں کا رسالہ ’’پھول‘‘ بھی دارلاشاعت پنجاب والوں نے شائع کیا۔میرے شوہر کا نام سید یوسف سردار ہے۔آپ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ سے ریٹائر ہوئے ہیں ۔انہوں نے میرے شوق سخن میں نہ صرف میری حوصلہ افزائی کی بلکہ کسی مشکل کو مشکل نہ رہنے دیا۔اسی وجہ سے میری ازدواجی زندگی کامیاب رہی۔دیکھا جائے تو نہ ہی شوہر بیوی جیسا بن سکتا ہے نہ ہی بیوی شوہر جیسی یہ تو مفاہمت کا راستہ ہے۔عورت کو زیادہ مفاہمت کرنی پڑتی ہے۔اگر عورت مرد کے مقابل آجائے گی تو بچے انتشار کا شکار رہوں گے۔زندگی میں سب کچھ کبھی کسی کو نہیں ملتا صرف اسی کو ملتا ہے جو قانع ہو قناعت سب سے بڑی دولت ہے۔اللہ کا شکر ہے اس نے سب کچھ سمجھنے کی توفیق دی۔بہت سے موقوں پر ہم افرادِخانہ نے ٹیوشن پڑھا کر اپنی ضروریات پوری کیں۔پہلے ہم نے رحمان پورہ میں گھر بنایا اسے بیچ کر ڈیڑھ لاکھ میں ماڈل ٹاؤن میں دس مرلے کا پلاٹ خریدا اور گھر بنایا۔جب شادی ہوئی میری عمر بہت چھوٹی تھی۔ساس بستر مرگ پر تھیں گھر میں ذمہ داریاں بہت تھیں کل

گیارہ افرادِخانہ تھے۔ میں نے سکول میں چونکہ ریڈکراس کی تربیت لے رکھی تھی اس لیے بہت خوش اسلوبی سے میں نے تمام کام سنبھال لیے۔خصوصاً ساس کو نہلانا دھلانا بستر بدلنا،انہیں وقت پر کھانا دینا، سبھی اچھی طرح کرلیا۔

س۔کیا شادی کے بعد تعلیم جاری رکھ سکیں؟

ج۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ میں نے سوچا ادیب عالم کا امتحان دے ڈالوں زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ فیل ہو جاؤں گی۔ دماغ میں جو پڑھائی کا کیڑا ہے وہ نکل جائے گا۔امتحان میں پندرہ دن باقی تھے جب میں ''سودا کے قصیدے'' کتاب لے کر آئی ۔کل تین کتابیں تھیں جو مجھے پڑھنا تھیں۔ میں نے امتحان دے ڈالا۔ جب رزلٹ آیا تو فرسٹ ڈویژن میں سے اکیس نمبر کم تھے۔کورس میں سے بہت کم پرچے میں آیا تھا۔ اس میں ایک سوال تھا فرحت اللہ بیگ کے افسانے ''مجھے دوستوں سے بچاؤ'' کی پیروڈی لکھیں میں نے لکھا ''مجھے میری سہیلیوں سے بچاؤ'' میرے بھائی نے کہا ممتحن جب یہ پڑھے گا تو تمہیں پاس کردے گا۔انگلش کا پیپر میں نہ دے سکی تب میری بچی کی پیدائش ہوئی تھی، دن بھر گھر سمیٹنا رات کو پڑھنا مشکل تھا۔

س۔آپ کے کتنے بچے ہیں اور کیا کیا کررہے ہیں؟

ج۔میرے چار بچے ہیں۔ایک بیٹی اور تین بیٹے ہیں۔ بڑی بیٹی درخشاں سلیم ہاؤس وائف ہیں۔سعودیہ ہوتی ہیں۔دوسرے بیٹے سید کامران یوسف نے مکینیکل ڈپلومہ کیا ہے۔ پہلے قطر گئے آج کل کینیڈا میں ہوتے ہیں۔ پھر حیدرعلی قاسمی ہیں انہوں نے ایم بی اے کیا ہے ان کی بیگم ڈاکٹر ہیں اور میری بھانجی ہیں۔ تیسرے بیٹے سید یاسر علی قاسمی ہیں۔لیبر ویلفیئر میں اسسٹنٹ سیکرٹری ہیں جو پنجاب حکومت کا محکمہ ہے۔

س۔ کیا بچوں کی تربیت کے حوالے سے کوئی مشکل رہی؟

ج۔مشکل اس لیے پیش آئی کیوں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کی تقلید کی جیسی انہوں نے ہماری تربیت کی ویسی ہم نے اپنے بچوں کی کی۔ بچے دوتوس لے کر دفتر جاتے ہیں۔اللہ کا شکر ہے کسی کا دیا نہیں کھاتے۔ وہ جس محکمے میں ہیں روزانہ اربوں کھربوں ان کے سامنے آتے جاتے ہیں مگر ایمان سلامت ہے یوں سمجھیئے فی زمانہ جہاد کررہے ہیں۔

س۔سب سے پہلا شعر کب کہا؟

ج۔ یہ کائنات کہن اور پھر جمیل اتنی
ہے تیری شانِ خدائی کہ میرا حسن
نظر

میرے والد صاحب نے جب یہ شعر سنا تو مجھے ڈانٹ کر پوچھا کس کا شعر ہے ۔کہاں سے پڑھا ہے؟''میں نے ڈرتے ڈرتے کہا''میں نے لکھا ہے۔'' یہ سننا تھا کہ والد صاحب پر جذباتی کیفیت طاری ہوگئی ان کے آنسو بہنے لگے انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور منہ ہی منہ میں میرے لیے دعا پڑھتے رہے۔ زندگی کے اس لمحے نے مرا کاغذ اور قلم کا رشتہ ہمیشہ محفوظ رکھا۔

س۔آپ نے با قاعدہ کب لکھنا شروع کیا؟

ج۔میرادیور سنٹرل ماڈل سکول بھاٹی میں زیر تعلیم تھا۔ اس نے مجھ سے کہا سائنس پر مضمون لکھ دیں وہ مضمون سکول میگزین میں چھپا۔ ماموں ممتاز نے پڑھ کر مجھے شاباش دی۔ پھر اسے ان کے بیٹے امتیاز علی تاج اور ان کی اہلیہ حجاب امتیاز علی نے پڑھا وہ مجھ سے خصوصی طور پر ملنے آئے اور میری حوصلہ افزائی کی ۔ مجھے معروف کمپیئر سلطان کھوسٹ سے ملنے کا بہت شوق تھا جن کا پروگرام بہت عرصہ تک ریڈیو سے نشر ہوتا رہا۔ میں ان دنوں نجمہ یاسمین نگہت کے نام سے لکھا کرتی تھی۔ بھائی مجھے ان سے ملوانے لے گئے ۔سلطان صاحب نے پہلے میرا نام پوچھا، نام سن کر کہنے لگے ایک نام آپ کا ہے دوسرا آپ کی بہن کا تیسرا کس کا ہے یہ تو میرا تخلص تھا۔نگہت تو جبھی کٹ گیا جب سب نے قہقہے لگائے۔معروف شاعر طفیل ہوشیار پوری ہمارے ہمسائے میں رہتے تھے۔ ایک روز ہمارے ہاں انہوں نے مجھ سے میری شاعری سنی اور کہا'' بیٹی! اللہ تعالیٰ اگر کسی کو کوئی صلاحیت دے اور وہ اس صلاحیت کو ضائع کردے تو روز محشر اس کو اس کوتاہی پر کوڑے پڑیں گے،بہت پرسش ہوگی۔'' پھر میں نے با قاعدہ لکھنا شروع کیا وہ خود آتے اور آکر میری شاعری لے جاتے جب وہ خود آتے تو ان کا ایک انگریز دوست یہ سب دیکھ کر حیران ہوتا کہ کیا یہ اتنی بڑی لکھاری ہیں جن کی نظمیں یہ خود آکر لے جاتے ہیں۔ میں ان کے کردار سے بہت متاثر ہوں۔ ایسے ہوتے ہیں بڑے لوگ جو دوسروں کو بڑا بنانے میں اپنا مثبت کردار ادا کرتے ہیں۔ پہلے ماحول ہی ایسا تھا جس کے اندر جو بھی جوہر تھا اسے سبھی سراہتے تھے۔خودنمائی کو برا سمجھتے

تھے۔

ہے شکستِ آئینہ ہی مری زندگی کا
حاصل
میرے دل کو بھا گیا ہے روئے بے
نشاں ہونا

س۔مشاعروں میں کیسے جانا ہوا؟

ج۔یوسف صاحب کی ممانی حمیدہ فاطمہ بی بلاک میں ''متاعِ ادب'' کے نام سے نشست رکھوایا کرتی تھیں۔بس شروع میں وہاں جانے کی اجازت ملی۔ بعد میں منیر نیازی، طفیل ہوشیار پوری، باقی احمد پوری، احمد ندیم قاسمی جیسے پائے کے شاعروں کے ساتھ مشاعروں میں حصہ لیا۔ 1997ء میں پاکستان کی گولڈن جوبلی منائی گئی۔فورم فری تھا۔جس کا جو جی چاہے پڑھے میرا بھانجا آیا۔ اسے میری نظم بہت پسند تھی جو پاکستان کے حوالے سے میں نے لکھی تھی۔ اس نے کہا وہاں چل کر یہ نظم پڑھیں۔وہاں میں نے یہ نظم پڑھی،بعد میں جنگ اخبار میں یہ نظم چھپی۔نوائے وقت اور جنگ والے مجھے مشاعروں میں بلاتے رہے۔الحمرا میں بہت سے مشاعروں میں شرکت کی۔ جیوٹی وی نے میری شاعری کے حوالے سے میرا انٹرویو لیا جسے تمام دنیا میں دیکھا گیا۔میرے رشتہ داروں نے مجھے فون کیے اور اسے سراہا۔

س۔آپ کی شاعری پر کس کی چھاپ ہے؟

ج۔یہ تو پڑھنے والے بتائیں گے۔

مرا وجدان ہے استاد میرا
تقطع سے قلم آزاد میرا
عطائے نعمت رب ہے سراسر
ہے زندہ نام میرے بعد میرا

س۔کیا آپ کی شاعری الہامی کیفیت ہے یا شعوری کوشش ہے؟

ج۔دونوں صورتیں ہیں۔الہامی کیفیت کو آمد کہتے ہیں،شعوری کوشش آورد کہلاتی ہے۔جو شاعری آمد کے ذریعے ہوتی ہے اس کی تاثیر اور اثر انگیزی علیحدہ ہوتی۔میری شاعری زیادہ تر آمد ہے۔میں اس وقت تک نہیں لکھ سکتی ہے جب تک کہ میں لکھنے کیلئے مجبور نہ کردی جاؤں۔میرے گھر میں گیارہ افراد کی ذمہ داری مجھ پر تھی صرف ایک مددگار تھی مگر رات کو شاعری کا کرب مجھے سونے نہیں دیتا تھا۔جب تک میں اسے لکھ نہیں لیتی تھی چین نہیں آتا تھا۔میں نے شاعری کی پہلی منزل کسی کو نہیں دکھائی کسی سے راہنمائی نہیں ملی۔

بہت سی کمیاں ہیں۔ مرا استاد کوئی نہیں۔ خوب سے خوب تر کی گنجائش رہتی ہے۔

س۔شاعری میں کس نے متاثر کیا؟

ج۔سارے شعراء اپنے اپنے رنگ میں اچھے ہیں۔سب سے زیادہ علامہ اقبال نے متاثر کیا۔گھر میں فارسی کا چرچا تھا اس لیے اقبال کو سمجھنے میں آسانی ہوئی۔ میں نے پروین شاکر جیسی شاعری نہیں کی۔ یک رنگی ہو جائے تو گلستان نہیں بنتا۔ ہر شاعر معروف نہیں ہوتا۔شہرت کے خانے اور ہیں اور کام کا صحیح ہونا علیحدہ چیز ہے۔

س۔آپ کی شاعری کے کتنے مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں؟

ج۔''دستِ دعا'' مجموعہ حمد و نعت ہے۔''سیپ سمندر موتی'' غزلیں ہیں۔''ممتا رنگ ہزار'' نظمیں ہیں اور ''اے پاک نسلو عظیم بچو۔'' بچوں کی نظمیں ہیں ''ماھتاب ادھورا'' زیرِ طبع ہے۔

س۔آپ کی شاعری کن رسالوں کی زینت بنتی ہے؟

ج۔بتول،عفت، بیاض،سفید چھڑی،آئینہ،نالۂ دل،نور، پھول، پیغام ڈائجسٹ، جنگ وغیرہ۔نوید سحر لندن سے نکلتا تھا۔ساجدہ زبیری مرحومہ اس کی مدیرہ تھیں۔وہاں سے فرمائش آئی آپ کی نظم ''آ گیا تیری پردیسی ماں'' ہم چھاپنا چاہتے ہیں اجازت دے دیں۔میں حیران ہوئی اتنی سی بات کیلئے مجھ سے اجازت مانگ رہی ہیں۔انہوں نے میری بہت سی نظمیں چھاپیں۔

س۔جو لوگ شاعری کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے مشورہ دیں؟

ج(ہنستے ہوئے بولیں) شاعری کوئی گھڑ سواری تو نہیں ہے جو سیکھ لی جائے۔شاعر ہونا الگ بات ہے۔ شاعر جس زاویے سے دنیا کو دیکھتا ہے عام لوگ نہیں دیکھ سکتے۔نثر نگار جو بات کئی صفحات میں بیان کرتا ہے شاعر اسے ایک شعر میں کہہ دیتا ہے۔شاعری کیلئے قافیہ پیمائی، ردیف کے رموز واوقاف سے واقفیت ضروری ہے

؎ کہکشاں دھول گردِ سفر روشنی  
مرے رہبر کی ہر رہ گزر روشنی

س۔کیا آپ نے نثر بھی لکھی؟

ج۔بہت کم۔ بتول میں دو افسانے چھپے۔اپنی کتب کا دیباچہ لکھا بچوں کی پانچ چھ کہانیاں تعلیم

وتربیت میں لکھیں۔ نثر لکھنا مشکل ہے۔ بہت وقت مانگتی ہے۔ یہ سب میرے اللہ کی عنایت ہے ایک گھریلو خاتون جس کے (پی آر) ذاتی تعلقات بھی نہ ہوں اس کی اتنی کتابیں چھپ جائیں۔ یہ اس کا شکر ہے۔

س۔ بتول سے تعارف کب ہوا؟

ج۔ بتول سے تعارف میرے بیٹے حیدر کے دوست اویس قریشی کے توسط سے ہوا۔ اویس قریشی کنگ ایڈورڈ کالج کے کیمسٹری کے استاد محمد طفیل کے بھانجے تھے۔ وہ غزالی سٹریٹ میں رہتے تھے۔ ان دنوں ہماری رہائش رحمان پورہ میں تھی۔ اویس اپنے ہاتھوں سے بتول لکھ کر لایا کرتا تھا۔ یہ تقریباً 1960ء کی بات ہے جب میں پہلی بار بتول سے متعارف ہوئی۔ رسالہ بہت اچھا لگا اس سے دلی عقیدت پیدا ہوئی۔ مجھے ہر وہ بات اچھی لگتی ہے جو عمل صالح کا راستہ دکھائے اسی لیے بتول شوق سے پڑھتی ہوں۔

س۔ حریم ادب میں کیسے آئیں؟

ج۔ سب سے پہلے فرزانہ چیمہ صاحبہ مجھے حریم ادب میں لے کر آئیں۔ ایک دو بار میاں بھی لے کر گئے۔ آنے جانے کا مسئلہ رہا اس لیے باقاعدگی سے نہ جا سکی۔

س۔ آپ نوجوان لڑکیوں کے لیے رول ماڈل کسے سمجھتی ہیں؟

ج۔ میں حضرت فاطمۃ الزھراؓ کی شخصیت سے بہت متاثر ہوں۔ میں انہیں نوجوان لڑکیوں کے لئے رول ماڈل سمجھتی ہوں۔ اس کے ساتھ میں سمجھتی ہوں ہر لڑکی کو اپنی والدہ کو رول ماڈل سمجھنا چاہیے اگر مائیں اس قابل ہوں تو۔ ماؤں کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس قابل بنائیں کہ ان کی بچیاں ان سے رہنمائی حاصل کریں۔ میں اپنی والدہ کو رول ماڈل سمجھتی ہوں۔ اسی لیے میرے بچے مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ وہ میری شاعری پڑھتے ہیں۔ میرے بیٹے کامران نے ٹورنٹو سینتھیس ہال میں میری نظم پڑھی ''آ گیا تیرا پردیسی ماں''، نظم پڑھنے کے دوران اس نے محسوس کیا کہ شاید سارا ھال خالی ہوگیا ہے اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا ہال میں موجود سبھی لوگ رو رہے تھے۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں۔

؎ آ گیا تیرا پردیسی ماں
چائے پلا دے جلدی سے
دل کو بے وطنی کے دکھ نے
چاٹ لیا بے دردی سے

ممتا کی گرمی دے مجھ کو
ٹھٹھر گیا ہوں سردی سے
ماں اس فون کی آس میں کب سے
آگ جلائے بیٹھی ہے
وقت کی تپتی بھٹی میں
دل کو سلگائے بیٹھی ہے
ہر برتن میں ہر پیالی میں
چائے بنائے بیٹھی ہے

س۔کیا آپ پاکستان کے تعلیمی نصاب سے مطمئن ہیں؟

ج۔ہمارے ملک کی پالیسیز ہمارے ملک میں نہیں بنتیں یہ باہر سے بن کر آتی ہیں۔ہم اس پر کنٹرول نہیں کر سکتے۔میرے پاس اولیول کی بچی ٹیوشن پڑھنے آتی تھی۔میں نے اس کے کورس کی کتاب میں عصمت چغتائی کا افسانہ ''لحاف'' دیکھا تو حیران رہ گئی۔یہ افسانہ نوعمر بچیوں کے پڑھنے والا نہیں تھا۔میں نے اس کی ماں کو بلایا تو بولیں ان کے سکول کا کورس آکسفورڈ سے بن کر آتا ہے۔میں نے کہا ہم کانٹے بو کر پھول کیسے اگائیں گے۔

س۔میڈیا کے حوالے سے کچھ کہنا چاہیں گی؟

ج۔میڈیا کے برے اثرات سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ بچوں کو دین کی طرف لائیں۔بچے گھر سے سب کچھ سیکھتے ہیں۔گھر کا ماحول اچھا ہونا چاہیے۔

س۔زندگی کا سب سے دکھی لمحہ کون سا تھا؟

ج۔دکھی لمحوں کو یاد نہیں رکھنا چاہیے اگر انہیں یاد رکھیں گے تو دکھ دیتے رہیں گے۔ماں باپ کا دنیا سے جانا،اولاد کا بچھڑنا دکھی لمحات ہوتے ہیں۔زندگی میں بے شمار دکھ ہوتے ہیں۔رشتہ داروں،ہمسائیوں اور قوم کے دکھ۔امید اور صبر کو پکڑے رکھیں تو زندگی آسانی سے گزر جاتی ہے۔

س۔آپ پچھلے گیارہ سال سے کینسر جیسے موذی مرض سے لڑ رہی ہیں۔اس بارے میں کچھ بتانا چاہیں گی؟

ج۔میں پچھلے گیارہ سالوں میں کئی بار موت کے منہ میں جا کر واپس آئی ہوں۔چار سال بستر پر رہی ہوں۔میں نے اللہ سے دعا مانگی ہے صبر شکر کی توفیق دے۔اگر مجھ سے کوئی اچھا کام لینا ہے تو اپنی رضا کے ساتھ زندہ رکھ۔تاکہ میں تیرے دین اور ملک وملت کیلئے کوئی اچھا کام کرسکوں۔بس اتنا جان گئی ہوں اگر زندگی ہو تو بڑی سے بڑی بیماری بھی اسے ختم نہیں

کرسکتی۔ بیماریاں اور آزمائشیں زندگی کا حصہ ہیں ان سے فرار ممکن نہیں۔ یہ بیماریاں ہمارے گناہوں اور غلطیوں کا کفارہ ہیں اس لیے ہمیں اللہ کی رضا پر راضی رہنا چاہیے۔پچھلے دنوں پانچواں آپریشن ہوا۔آج کل ''انمول'' ہسپتال میں زیرِعلاج ہوں۔

س۔بتول کے قارئین کے لیےکوئی پیغام؟

ج۔پڑھنے اور لکھنے والوں کو میں یہی کہنا چاہوں گی کہ وہ حضرت محمدؐ کی سیرت کی اقدار کو اپنائیں۔ سیرت النبیؐ کا وہ تاریخی واقعہ ''جس میں یہودی عورت نبی پاکؐ پر روزانہ کوڑا پھینکتی تھی جب ایک روز بیماری کی وجہ سے اس نے کوڑا نہ پھینکا تو آپؐ اس کی مزاج پرسی کیلئے تشریف لے گئے اور جب تک وہ تندرست نہ ہوگئی۔ اس کے گھر کا سارا کام کرتے رہے۔'' اس واقعے میں حضورؐ کے صبر و برداشت اور حسنِ سلوک کا جو مثالی کردار ہمارے سامنے آتا ہے وہ پوری انسانیت کیلئے امن کی شاندار مثال ہے۔ پوری دنیا کی تاریخ میں ایسی مثال کا ملنا محال ہے۔بس اسی کو اپنائیں آج جو ہمیں دہشت گرد کہتے ہیں انہیں بتائیں کہ ہمارے نبیؐ کا یہ کردار تھا ہم اسی کو ماننے والے ہیں۔نوجوان لڑکیاں اپنے آپ کو ایسی شخصیت بنائیں جو آئندہ نسلوں کیلئے رہنما ہو۔

س۔کوئی پسندیدہ دوتین اشعار سنایئے۔

ج۔ احتساب نفس اپنے گھر سے ہونا چاہیے
اپنے فلکروفن سے مال وزر سے ہونا چاہیے
محض شہرت کیلئے یہ کام کاروبار ہے
کام یہ سارا خدا کے ڈر سے ہونا چاہیے
زندگی کو تب بسر کرنے کا آتا ہے شعور
جب سفالِ زندگی گر گر کے ہوجاتا ہے چُور

آپ سے گفتگو کرکے بہت اچھا لگا۔آپ نے بیماری کے باوجود ہمیں وقت دیا۔آپ کے قیمتی وقت کا بہت بہت شکریہ۔

☆☆☆

# زندگی ہے غم ہی غم

اسلامی نظریہ صحافت کے علمبردار کی حیثیت سے پروفیسر سید مختار الحسن گوہر کسی تعارف کے محتاج نہیں ۔ان کی صحافتی زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے ۔چہرے پر مسکراہٹ سجائے تھک کر نہ بیٹھنے والا یہ مجاہد گذشتہ دنوں صاحب فراش رہا، فالج کے حملے نے جسم کے ایک حصے کو متاثر کیا جوان کی حرکات وسکنات میں رخنہ انداز ہوا۔تندرستی کی جانب گامزن گوہر صاحب بڑے مایوس واداس دکھائی دیتے تھے جس کی اصل وجہ نماز کی باجماعت ادائیگی نہ ہونا تھی ۔ بلاشبہ ہر مسلمان کی یہی آرزو رہنی چاہیے کہ جب تک سانس ہے اس فرض عبادت کی ادائیگی کا اہتمام کرے ۔کیونکہ یہی جنت کی کنجی ہے اور جس پہلے سوال سے سامنا ہوگا وہ نمار کے حوالے سے ہے۔

گوہر صاحب سے میرے تعلقات تین عشرے سے زائد پر محیط ہیں۔گوہر صاحب کی خوش مزاجی اور ملنساری کا میں ہمیشہ سے معترف ہوں۔وہ سخت سے سخت حالات میں بھی چہرے پر مسکراہٹ سجائے رہتے ہیں۔مگر محض دو سال قبل جب وہ مجھ سے ملنے آئے تو انتہائی مضحمل اور رنج وملال سے یوں حسرت ویاس کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ان کی یہ حالت دیکھ کر میں بڑا متفکر ہوا۔ان کی بات سن کر میں سوچوں میں کھوگیا ۔گذشتہ ایک عشرے میں مختلف نوعیت کے کینسر کے مریضوں سے سابقہ پڑچکا ہے۔علاج بھی کیسا آپریشن ،شعاعیں لگنا، کیموتھراپی اور پھراس کے بد اثرات جس کے نتیجے میں بھنوؤں اور پلکوں کے بال ہی نہیں جھڑتے انگلیوں کے ناخن بھی ختم ہوجاتے ہیں۔

آج کے اس زمانے میں کہ جب جینیٹک سائنس اور دیگر شعبوں میں ترقی اپنے عروج پر ہے کینسر نامی مرض کے سامنے دنیا کے تمام مسیحا بے بس اور لاچار ہیں۔ مرض کی تشخیص سن کر میری کیفیت بھی گوہر صاحب سے کچھ زیادہ مختلف نہ رہی۔اپنے جس جیون ساتھی کی علالت پر آج وہ غم واندوہ کی تصویر بنے بیٹھے تھے وہ انتہائی قناعت پسند اور صابر وشاکر خاتون ہیں۔ آج سے تیس سال قبل جب گوہر صاحب کے مالی

حالات کچھ زیادہ اچھے نہ تھے این ڈی وی پی لیکچرار کی حیثیت سے کچے دھاگے سے بندھی درس وتدریس کی ذمہ داری چھوٹ جانے کے بعد گوہر ٹینسز (Gohar Tenses) کے نام سے اک چارٹ لئے تعلیمی اداروں میں جاتے ،طلباء وطالبات کوانگریزی میں مشق حاصل کرنے کیلئے Tenses کی اہمیت بتاتے اور پھر چار آنے میں اس چارٹ کوفروخت کیلئے پیش کرتے۔پھر اخبارات و رسائل کے اشتہارات بک کرنے لگے ۔رہنے کی جگہ اتنی چھوٹی تھی کہ اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ربانی مسجد کورنگی نمبرایک کی دودکانوں کے گرد احاطہ کھینچ کر بنیادی ضروریات جمع کی گئی تھیں۔یہ رہائش گاہ چالیس گز کے رقبے پربھی نہ ہوگی مگر زوجین بڑی منکسر المزاجی کیساتھ ہمہ وقت اللہ کا شکر ادا کرتے۔ بلاشبہ سنجیدہ صاحبہ کے صبر وتوکل کی بدولت گوہر صاحب بھی بڑے پرسکون اور رب تعالیٰ کے شکرگزاررہا کرتے۔

مجھے خوب یادہے کہ معاشی طور پرکمزورہونے کے باوجودبھی وہ مہمان کی تواضع اپنا فرض اولین جانتے ۔جب بھی کبھی ملاقات کو جانا ہووہ چائے یادیگراشیاء سے تواضع کرتے ۔کبھی کبھی بغیر دودھ کی چائے پیش کرتے اوراس کی ایسی خوبیاں گناتے تو لگتا کہ دودھ کی چائے مضرصحت اوراسراف ہے آئندہ قہوہ ہی نوش جاں کرنا چاہیے۔اس موقع پر یہ خیال تک نہ رہتا کہ یہ سب کچھ دودھ کی عدم دستیابی کی وجہ سے بیان کررہے ہیں۔ کبھی بھنے ہوئے چنے پیش کرتے ان کےفوائد گنواتے توان چنوں میں بادام اورپستوں کی لذت محسوس ہونے لگتی۔درس وتدریس اورصحافت کےشعبوں سے وابستہ رہتے ہوئے انہیں گفتگو کا فن خوب آتا تھا یوں اپنی پریشانیوں اور مسائل کا اظہار کرنے کے بجائے کسی نئے پہلو کو اجاگر کرکے باتوں کو نیا رخ دے دیتے ۔اکثرکہا کرتے کہ'' مجھے زندگی سے عشق اپنی اہلیہ کی وجہ سے ہوا ہے جو بڑی باہمت اورصابروشاکرخاتون ہیں کبھی خواہشات اور ضروریات کا اظہار نہیں کرتیں،ہمیشہ میرا خیال رکھتی ہیں،میں کہتا ہوں کہ اپنے کپڑے بنوالیں تو جواب ملتا ہے میں تو گھر میں رہتی ہوں آپ کو بنوانے چاہئیں کیونکہ آپ باہر رہتے ہیں اور لوگوں سے ملنا جلنا رہتا ہے'' شادی بیاہ کی تقریبات اورعیدبقرعید کے تہوار آتے تو بھی سنجیدہ صاحبہ بچوں کی ضروریات کو پورا کرنے کی خاطر ہمیشہ ایثار کا ثبوت دیتیں۔ایک دور وہ بھی آیا جب گوہر

صاحب بلدیہ عظمیٰ کراچی کے کونسلر منتخب ہوئے۔سخت آزمائش کا دور تھا۔تحریک نے قلب وذہن میں امانت ودیانت کا تصور جاگزیں کیا تھا جبکہ ٹھیکیدار اور انجینئر دنیوی مصلحتوں کو پیش کرکے مستقبل بنانے کا مشوہ دیتے۔اللہ اللہ کرکے یہ دور گزرا اور بڑی ثابت قدمی کے ساتھ گزرا جس کا سہرا بھی ان کی اہلیہ کے سر ہے کیونکہ خواتین اکثر طعنے اور طنز کے ذریعے مردوں کو جاو بے جا کی طرف راغب کرتی ہیں مگر یہاں تو خاتون خانہ دیانت وامانت کے سبق کو ازبر کرچکی تھیں اس لئے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہ آسکی۔

بچے بڑے ہوئے تو کاروبار کو بھی وسعت ملی ۔پرنٹ میڈیا کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا کیلئے اشتہارات تک دائرہ وسیع ہوا۔یہ گھرانہ ایک متمول علاقے میں منتقل ہوگیا مگر پرانے علاقے سے تعلق ہمیشہ قائم رہا۔کم وبیش ہر ہفتے یہاں آنا جانا رہا۔عزیز و اقارب کے علاوہ ملنے جلنے والوں کی اتنی طویل فہرست تھی کہ ہر ہفتے آنے کے بعد بھی تشنگی باقی رہتی۔

گوہر صاحب کی اہلیہ اپنے مرض سے بے خبر علاج میں مصروف رہیں ۔کبھی کہتیں ''دوا بھی باقاعدگی سے لیتی ہوں مگر تکلیف بڑھتی جارہی ہیں ،کمزوری بھی غالب ہے،بھوک کم لگتی ہے'' ان کی موت سے محض تیس گھنٹے قبل گوہر صاحب نے فون کرکے پوچھا ''آپ ہی کچھ بتائیں کیا کھلائیں کیونکہ بھوک بالکل غائب ہے،لیٹرین بار بار جارہی ہے،نقاہت حد سے زیادہ ہے ،سہارے کے بغیر چلنا ممکن نہیں'' میں نے ان کی صاحبزادی سے کچھ مزید معلومات حاصل کرکے کہا ''جس چیز کی خواہش کریں کھلا دیں اب پرہیز کی ضرورت نہیں'' اور پھر اگلے روز فجر کے بعد گوہر صاحب کا فون آیا جسے سننے کیلئے میں پہلے ہی تیار تھا دوسری جانب سے ان کی رندھی ہوئی آواز آئی ''وہ چلی گئیں'' ،میں کہا ''انا اللہ وانا الیہ راجعون''

صبح گیارہ بجے کے قریب جنازہ اٹھا ،اس جنتی خاتون کو کاندھا دینے والوں کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل تھی جو ان کے پرانے پڑوسی تھے۔اہل خانہ غم سے نڈھال تھے اور ان سب میں گوہر صاحب بڑے نڈھال مگر صبر کا پیکر بنے تعزیتیں وصول کررہے تھے۔

قلب غمگیں ،روح غمگیں زندگی
ہے غم ہی غم
از جہانِ چشم تا دنیائے دامن نم ہی
نم

بحیثیت صحافی سید مختار الحسن گوہر کے قلم کا اعجاز مجھ پر نہیں لاتعداد قارئین پر عیاں ہے۔گوہر صاحب کی تحریریں اصلاح معاشرہ کی خاطر ہوا کرتی ہیں۔وہ اپنے اسلاف کی روایات کو زندہ کرنے کیلئے پرانے موضوعات کو نئے ڈھنگ میں اپنے کالموں کی زینت بناتے رہے۔وہ محض گفتار کے غازی نہیں بلکہ کردار کے بھی غازی ہیں۔سلام کرنے کی روایت کو زندہ و جاوید رکھنے کیلئے ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔جہاں سے گزریں مسکراتے ہوئے چھوٹے اور بڑے سب کو سلام کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے محلے میں وہ چھوٹے بچے جو منہ سے سلام نہیں کر پاتے ہاتھ آگے بڑھا کر سلام کا اشارہ کرتے نظر آتے ہیں۔سلام کی یہ روایت جو حدیث نبویؐ کی تعمیل میں ہے۔گوہر صاحب کیلئے بھی سودمند ثابت ہوئی اور وہ بہت جلد صحت یاب ہوکر پہلے مسجد اور پھر احباب سے تعلق جوڑنے میں کامیاب رہے۔ضعف اور کمزوری ضرور غالب ہے مگر تحریک کے تمام پروگراموں میں ہمیشہ کی طرح پرجوش انداز میں شامل رہتے ہیں۔میرے یہاں ہونے والی سیرت کانفرنسؐ میں درود وسلام پڑھنے کی روایت سے ان کا ناطہ جڑا ہے۔قلم وقرطاس کا رشتہ بھی قائم ہے اسی لئے ہمت واستقامت کیساتھ بڑے پرامید بھی ہیں کہ باعمل اور متحرک زندگی گزارنے میں کوشاں رہیں گے۔رہا وہ دکھ جو ان کے قلب و ذہن میں سرایت کرچکا ہے تو شاید کبھی نہ بھلایا جا سکے۔کیونکہ اپنے جیون ساتھی کے بنا زندگی گزارنا کٹھن کام ہے۔ہم سب کی دعائیں اور اللہ کی رحمت انہیں تادیر ہم پر شجر سایہ دار کی طرح قائم رکھے۔آمین

☆☆☆

# دلوں میں جگہ بنائیے

نصیحت اور اصلاح کرنے کے لئے اس اہم اصول کو یاد رکھنا ضروری ہے

ہر انسان اپنے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی ہر غلطی اور کمزوری پر بھی اس کے پاس کوئی نہ کوئی جواز ہوتا ہے۔ یہی انسانی ذہن کی کمزوری ہے کہ وہ اپنے آپ کو بے قصور اور اپنے کاموں کو بالکل ٹھیک سمجھتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا لوگوں کے دلوں میں بھی اسے وہ مقام حاصل ہے؟ کیونکہ تعلق ہونا یا یا تعلقات رکھنا دونوں میں بہت فرق ہے۔ بعض اوقات تعلقات تو ہوتے ہیں لیکن تعلق نام برابر بھی نہیں ہوتا اور کبھی تعلق ہے تو تعلقات چل کر ہی نہیں دیتے۔ ہم عام طور پر لوگوں میں کس قسم کی خوبیاں دیکھنے کے خواہشمند ہوتے ہیں؟ اس بات کو جاننے کے لیے ایک سروے ہوا جس کے مطابق جو صفات دوسروں میں دیکھنا پسند کی جاتی ہیں وہ ہیں ذہانت، خوش مزاجی، دوستانہ رویہ اور ہم ذوق ہونا۔ اور جن صفات سے لوگوں میں آپ کا احترام ہو ان میں اہم ترین صفات سچائی، خدمت گزاری اور خلوص و بے غرضی ہیں۔

ان صفات کے ساتھ ہی اب دوسروں کے ساتھ معاملات اور رویہ میں جس بات کی ضروت ہے وہ یہ ہے کہ مخاطب سے ذہنی قربت حاصل کی جائے۔ ایسی فضا تیار کریں کہ وہ کھل کر بے تکلفی سے اپنے دل کی بات آپ کے سامنے رکھ سکے۔ قربت کا رشتہ مضبوط کیے بغیر نصیحت یا اصلاح کا کوئی قدم بھی درست نہیں ہوگا۔

یہ مقام حاصل کر لینے کے بعد اس کی کسی ایسی کوتاہی کی طرف توجہ دلائیں جسے دور کرنا اس کے لئے آسان ہو اور پھر اس پر اصرار نہ کریں۔ اس کو پستی سے بلندی کی طرح کھینچ لے جانے کے لئے ہمت اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ دلوں میں جگہ پیدا کرنے کے لئے لوگوں کی خوبیوں کا تذکرہ کیجیے جو واقعی ان کے اندر ہوں۔ کوئی انسان کبھی اچھائیوں سے خالی نہیں ہوتا۔ خوشامد اور جائز تعریف کے فرق کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔

**نکتہ چینی دلوں کو دور کر دیتی ہے:**

نکتہ چینی سے پرہیز کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم

دوسرں کی کمزوریوں اور خرابیوں پر توجہ نہ دیں۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ دوسرے کی کمزوریوں کو محسوس کرنے کے بعد اس کا تذکرہ ایسے نہ کریں کہ ناگوار ہو۔ کوتاہیوں پر گرفت کرنے سے احساسات کو سب سے زیادہ ٹھیس پہنچتی ہے۔ کوئی شخص بھی اپنے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کے اندر کوئی خرابی ہی نہیں۔ لیکن چاہتا وہ یہی ہے کہ اصلاح کا فرض انجام دے لیکن درحقیقت وہ اصلاح کا دروازہ بند کررہا ہوتا ہے اور تعلقات میں بھی ناخوشگواری پیدا کرلیتا ہے۔

دوسروں کی کوتاہیوں کو محسوس کرتے ہوئے ان حالات کا بھی ٹھنڈے دل سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے جہاں آپ نہیں ہیں۔ لہٰذا کوئی ایسا طریقہ اختیار کریں کہ وہ خود اپنی اصلاح کی طرف مائل ہو۔ آپ کے اندر موجود اخلاص و ہمدردی ایک خاموش ناصح کا کام کرے گی۔

آنحضرتؐ کا ارشاد ہے: ''تم اپنے بھائی کو مسکرا کر دیکھو تو یہ صدقہ ہے۔'' بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ہنس مکھ رہنے کی اہمیت سے واقف ہیں۔ دلوں کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے خندہ پیشانی ایک زبردست ہتھیار ہے۔ ہر قسم کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ انسان خوش مزاج رہے۔ مانا کہ پریشانیاں دل کو بے چین رکھتی ہیں۔ لیکن اس کے اظہار سے ہر ممکن اجتناب کیجیے۔ مسکراہٹ اور خوش دلی و خندہ پیشانی سے پیش آنا دوسروں سے قریب کرے گا اور پریشانی پر بھی قابو پانے کی قوت ملے گی۔

**مخاطب کے دل میں جگہ پیدا کریں:**

دوسروں کی باتیں سننے کی مشق کریں۔ اس کی باتیں توجہ اور دلچسپی سے سنی جائیں تو آپ اپنی مختصر بات سے دوسرے کو دوست بنا سکتے ہیں۔ کسی کی بات سننے کے بعد جواب دینے میں بھی سلیقہ ہونا چاہیے۔ گفتگو کے درمیان آپ کی جانب سے کوئی ایسا سوال نہ ہو جو مخاطب کو رنجیدہ کرنے والا ہو۔ یا اس کو اپنی کسی کمی اور کمزوری کا اعتراف کرکے ندامت اٹھانا پڑے۔ ایسے سوالات جو اس کو ذہنی خوشی اور مسرت دینے والے ہوں۔ اس طرح آپ اس کے دل میں بڑی جگہ پیدا کرسکتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی بہت اہم ہے کہ گفتگو کے موقع پر بات وہاں سے شروع کریں جہاں مخاطب کا جواب ہاں (مثبت) میں ہو۔ **تعالوا الی کلمہ** (آؤ پہلے ان باتوں پر متفق ہولیں جن سے ہم اور تم اتفاق رکھتے

ہیں) کا قرآنی اصول اسی کا مظہر ہے۔

سقراط کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ مخاطب کو اپنا ہم خیال بنانے کیلئے ہمیشہ ایسے سوالات کیا کرتا تھا جن کا جواب لوگ اثبات میں دینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ وہ ایسے رخ سے گفتگو کرتا کہ مخاطب اقرار پہ اقرار کرتا چلا جاتا۔ یہاں تک کے وہ مخاطب سے وہ بات بھی منوا لیتا جو کہلوانا چاہتا تھا۔ گفتگو کی ابتدا میں اگر انکار یا اختلافی ردعمل پیدا ہو جائے تو شخصیت کا غرور اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے انکار پر ہی قائم رہے۔

ہر شخص کی کچھ نہ کچھ دلچسپیاں ضرور ہوتی ہیں۔ تھوڑی سی توجہ سے آپ جان سکتے ہیں کہ لوگوں کی دلچسپی کن باتوں میں ہے۔ مناسب اور جائز حد تک مخاطب کی دلچسپی کے موضوعات پر بات کرنے سے آپ دلوں میں اپنے لیے بڑی جگہ پیدا کر سکتے ہیں۔

ہر انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی قدر کی جائے اور اسے اچھی نظر سے دیکھا جائے۔ لہٰذا دوسروں کی قدر افزائی کے موقعے تلاش کیے جائیں۔ عیبوں پر نظر رکھنا آسان ہے۔ اس کام کو دوسروں کیلئے چھوڑ دیجیے اور خوبیوں پر نظر ڈالنے کی عادت پیدا کریں تو دیکھئے لوگ کیسے آپ کی طرف مائل ہوتے ہیں اور آپ کی بات کو اہمیت دینے کو تیار رہتے ہیں۔

بعض اوقات آپس کی گفتگو بحث کا رخ اختیار کر لیتی ہے اور بات کہیں سے کہیں نکل جاتی ہے۔ ایسا موقع ہرگز نہیں آنے دینا چاہیے اور اگر اس حالت میں پھنس بھی جائیں تو اس میدان میں ہار مان لینا ہی جیت ہے۔ بدکتے ہوئے گھوڑے کو راستہ دے دینا ہی بہتر ہے نہ کہ راستہ روکنے میں آپ چوٹ کھا جائیں۔

ضروری نہیں کہ آپ جس بات کو غلط محسوس کرتے ہیں اسے فوراً غلط کہہ بھی دیں۔ اگر ابتدائی مرحلے میں آپ اپنی رائے کا اظہار نہ کریں تو کوئی نقصان نہیں یہ گفتگو کسی اور موقع کیلئے بھی اٹھا رکھی جا سکتی ہے۔

براہ راست کسی کے ذاتی مسئلے پر گفتگو کرنے کی بجائے اگر عمومی موضوعات کا تذکرہ کیا جائے تو آپ مخاطب کے ذہن کو اس نکتے کی جانب متوجہ کر سکتے ہیں جو آپ کے ذہن میں ہے۔ مثلاً اخلاقی گراوٹ کے خلاف کسی کی شخصیت کو ہدف بنانے کی بجائے عمومی حالات کی سنگینی کا تذکرہ کیا جائے۔

اس کے لیے ذہنی اور علمی تیاری کی بھی ضرورت ہے۔ اپنے مخاطب کے سامنے کچھ ایسے سوالات رکھیں جن سے سوچنے کی دعوت ملے، جیسے موجودہ بداخلاقی

کے دور میں بھلے انسان کیسے بنائے جائیں؟ کائنات میں انسان کا کام کیا ہے؟ اخلاقی زوال کس کس طرح سرائیت کر رہا ہے؟ بیشک مخاطب بات کو قبول نہ کرے مگر اسے کافی سمجھیں۔ ایک ہی صحبت میں پوری بات ذہن میں اتارنے کی کوشش نہ کریں۔

کامیاب شخص وہی ہے جو مخاطب سے بات چیت کرتے وقت اس بات کی پوری رعایت دیتا ہے کہ وہ کس ماحول میں رہتا ہے اور پوری طرح جانتا ہے کہ اس نے خود اس ماحول میں آنکھیں نہیں کھولیں۔ منطق اور دلیل سے آپ لوگوں کو خاموش تو کر سکتے ہیں لیکن دل سے قائل نہیں کر سکتے اور جب تک انسان دلی طور پر قائل نہ ہو وہ کسی بات کو قبول کرنے یا چھوڑ دینے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ یہ کام منطق، دلیل، بحث اور نکتہ چینی کا نہیں بلکہ جذبات کا ہے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس کی ذہانت، نیکی، خیر پسندی، خدمت خلق، سیرت، کردار کی پختگی کو اپیل کیا جائے تا کہ یہ اثر پائیدار رہو۔

☆☆☆

# محشر خیال

ڈاکٹر شگفتہ نقوی

پیارا بتول وقت کی پابندی میں پھر جیت گیا۔ سرورق بہار کی آمد کی ایک نوید اور رنگوں کا خوبصورت امتزاج ہے۔ بتول کی ایک اور واضح خوبی جو بہت سے قارئین نے پسند کی کہ اس کا Font بڑا ہے جو بآسانی پڑھا جاسکتا ہے۔ اداریہ میں بہت ہی جچے تلے انداز میں حالات حاضرہ کا پوسٹ مارٹم کیا گیا۔ ایوب خاور کے کلام نے اندر تک ہلا دیا۔ اللہ پاک رحم فرمائیں۔ نفس کا تزکیہ، سورۃ الضحیٰ کا ترجمہ اور تفسیر، حقیقت کی ترجمانی کرتی ہیں کاش ہم جو سب غفلت میں ہیں، بیدار ہوجائیں۔ نماز ہمیں کیا سکھاتی ہے، بہت اچھی طرح تفصیل سے نماز کے ایک ایک رکن کی کیفیت ،مقصد اور دعائیں بیان کی گئیں، اگر یہ تمام باتیں یاد رہیں تو نماز قبولیت کے مقام تک پہنچ سکتی ہے۔ تذکرہ صحابیات میں رسول پاکؐ کی پھوپھی محترمہ حضرت صفیہؓ کی ایمانی طاقت اور جرأت کا تذکرہ ایمان افروز ہے۔ نجمہ یاسمین یوسف کی نعت پڑھ کر ''حریم ادب'' میں ان سے ملاقات (جو میری خوش نصیبی تھی) یاد آگئی۔ یہ شعر تو حاصل نعت ہے:

بے خوف چلے آؤ جو مانگو گے ملے گا

بازارِ محبت ہے یہاں سودا کھرا ہے

اللہ انہیں خوش رکھے اور صحت سے نوازے، آمین۔ شاہدہ سحر نے اپنے نام کی طرح روشنی کا پتہ دیا ہے۔ خدا کرے اس سحر سے ہمارا جلد سامنا ہوسکے۔ عالمی یوم خواتین کے موقع پر شمیم فاطمہ کی کہی گئی نظم حقیقت افروز ہے۔ اللہ کرے کہ ہمارا معاشرہ عورت کو اس کا جائزہ مقام دے سکے آمین۔ ربیعہ ندرت کی ''مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا۔'' بہت خیال افروز تحریر ہے جو اس جہان فانی میں اس طرح رہنے والوں سے متعارف کراتی ہے۔ یہ جہاں سب فنا ہے، سب نے چلے جانا ہے۔ حریم ادب میں جب ان کی زبانی سنا تھا تو ان کے گھمبیر لہجے نے

بڑا لطف دیا تھا۔ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ ''کالی چادر'' یہ سفاک واقعہ پچھلے سال پیش آ چکا ہے۔ عظمیٰ نے اسے کہانی کا روپ دے کر اسے تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ قابل افسوس مقام ہے کہ قاتل دندناتے پھرتے ہیں اور مقتول کا خاندان در بدر ہو گیا۔ قمر پرویز جو روشنی لے کر آئی ہیں میری دعا ہے کہ ہمارے دلوں کو منور کر دے اور نیک اعمال سے اندر باہر اجالا ہو جائے۔ فرحی نعیم کے آلوؤں نے بہت مزہ دیا۔ یہ ایک نیم مزاحیہ مضمون ہے بس اس کے عنوان سے ذرا گڑبڑ ہوگئی۔ ایک واقعہ یاد آ گیا۔ گورنر مغربی پاکستان امیر محمد خان برطانیہ گئے تو شاہی محل میں ان کی دعوت تھی۔ جب انہوں نے گوشت جو ہڈی والا تھا وہ اٹھا کر کھایا تو حاضرین محفل میں سے کسی نے طنزاً کہا:

''میں حیران ہوں خاں صاحب کا کتا کیا کھاتا ہوگا (مطلب یہ کہ ہڈی کے ساتھ والا گوشت بھی اتار کر کھا رہے ہیں)

انہوں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ''میرا کتا آلو کھاتا ہے۔'' (انگریزوں کو آلو بہت پسند ہیں)۔

آلو کی کہانی پڑھ کر خیال آیا کہ واقعی دنیا میں سب سے زیادہ کھائی جانے والی سبزی آلو ہی ہے۔

نصرت محمود قریشی سے بھی حریم ادب میں یادگار ملاقات رہی۔ ''اسمائے حسنیٰ'' کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ علم تازہ ہو جاتا ہے شکریہ۔ ''دستک'' انسانی سنگدلی اور دورخی کی بہترین مثال ہے:

؎ ایک چہرے پر کئی چہرے چڑھا لیتے ہیں لوگ!

''شکست کے رتھ پر سوار'' نصرت یوسف کا ناول ہے جس کی یہ پہلی قسط ہے۔ اٹھان لاجواب ہے۔ دیکھیں آگے کیا دکھائی دے۔ خاصی طویل قسط ہے۔

آسیہ راشد اب انٹرویو لینے میں ماہر ہو چکی ہیں اور بتول کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہیں۔ ان کے لئے ہوئے انٹرویو ہمیشہ دل چسپ اور معلوماتی ہوتے ہیں۔ مسز عذرا سرفراز کی ایک بات پر تبصرہ کروں گی انہوں نے کہا کہ سکول میں بچوں کے پاس وقت کم ہوتا ہے۔ حالانکہ بچے شام کو گھر واپس آتے ہیں، بستہ بھاری، اس کے بعد قاری، پھر اکیڈمی رات کو ہوم ورک...... اگر نہ کریں تو دوسرے دن سزا ملے گی۔ ان کے پاس تو کھیلنے کا وقت بھی نہیں ہوتا۔ بچے اسلامیات سے اس لیے دور ہیں کہ انہیں اردو نہیں آتی۔ تمام مضامین انگلش میں ہیں لہٰذا وہ زبان تو انہوں نے سیکھ ہی لینی ہے۔ اس فورم پر یہ کام ضرور

ہونا چاہیے کہ ہم اپنی پیاری زبان اردو کو اس کا جائز مقام دلوائیں سرکاری زبان اردو ہونی چاہیے۔ بچے انگلش کی کتابیں پڑھتے ہیں کیونکہ انہیں وہ آسان لگتی ہے۔ اردو زبان میں ہمارا مذہبی، معاشرتی اور سماجی ادب شاعری موجود ہے۔ جب ہماری نئی نسل اس سے کٹ گئی تو گویا وہ ایک دوسری تہذیب کے پروردہ ہو گئے۔

حمیرا خالد نے ''مردحق گو'' ناصر خان صاحب (جو آپا بنت مجتبیٰ مینا کے چچا جان تھے) کے بارے میں تفصیلی مضمون لکھ کر بہت بڑا احسان کیا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو ہمارے لیے مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کا کردار آنے والی نسلوں کو روشنی، رہنمائی، طاقت اور جرأت مندی عطا کرتا ہے۔ ایک مرد مومن کا کردار......سبحان اللہ۔

یہ بات کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے
قرآن

امید ہے کہ حمیرا آئندہ بھی ایسے کرداروں کے بارے میں لکھ کر ہمارے ایمان میں اضافے کا سبب بنیں گی۔ آمنہ بلوچ کا مضمون آنکھوں دیکھی فلم تھی کہ یہی سب کچھ آسٹریلیا میں بھی ہو رہا ہے اور ہم نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سب دیکھنے یا اس کا حصہ بننے پر مجبور ہیں۔

رفعت اشتیاق کی دائمی جدائی اشکبار کر گئی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ انہوں نے قانتہ رابعہ کی ''اسے زندہ کر دوبارہ'' پر جو تبصرہ کیا ہے اس نے رلا رلا دیا۔ قانتہ رابعہ لاجواب لکھتی ہو ،سلامت رہو۔ میں نے بھی تبصرہ لکھنے کا سوچا تھا لیکن رفعت اشتیاق کا تبصرہ پڑھ کر میں نے قلم رکھ دیا۔ اس نے اتنے خوبصورت لہجے اور جذباتی انداز میں لکھا ہے کہ اب لکھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اب ہم نے ان کے پاس جانا ہے۔ وہاں سے تو کوئی واپس نہیں آتا۔

افشاں نوید! کیسی ہو۔ آپ کی تحریریں ہمیشہ جاندار ہوتی ہیں ''سوشل میڈیا کا جن''، ایسی حقیقت ہے جس کا ادراک باشعور طبقے کو ہے۔ رشتے داروں کو خبر نہیں ہوتی لیکن دوست سب جان جاتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جو لوگ اس میڈیا کیلئے اخلاقی ضابطہ بنا سکتے ہیں وہ اس تحریر کو پڑھیں اور اس پر عمل کریں تو بات بنے۔ باقی میڈیا کا بھی یہی حال ہے۔ ہم بیرون ملک

جب اپنے ٹی وی کو دیکھتے ہیں تو غیر ملکی مصالحے اور اپنے ٹی وی میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ہم ان کی طرح سب کچھ دکھانے لگ گئے ہیں۔حیا، رازداری سب ختم ہوگیا ہے ۔بہت اچھی تحریر ہے بلکہ گا ہے بگاہے سب کو اظہار خیال کرتے رہنا چاہیے۔کیا معلوم کس کی بات اثر کر جائے۔

امیمہ امجد مبارک ہو، بڑا اچھا سودا طے کر کے آئی ہو۔ شبانہ یونس کے نام۔کہاں ہو اگر لاہور میں ہوتو کبھی حریم ادب میں آؤ۔ ملاقات ہوجائیگی سب سے۔

آخر میں ادارہ بتول کیلئے بہت ساری دعائیں اور صائمہ اسماء مبارک باد کی مستحق ہیں۔پرچہ بہت اچھا جارہا ہے۔اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔سب کے لئے بے شمار دعائیں۔

☆ڈاکٹر صاحبہ! آپ کی محبتوں کے لئے ممنون ہیں۔(مدیرہ)

☆☆☆

فرحت طاہر۔کراچی

بتول کا معیار واقعی بہت ہی اچھا ہے۔ ماہ بہ ماہ تفصیل کی تو گنجائش نہیں مگر دسمبر کے شمارے کی بات کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں کہ اس میں میرا مضمون ہے۔وہ تو بس کچھ یونہی سا ہے۔مستقل لکھاریوں کی جن میں نصرت یوسف اور شمیم فاطمہ ہیں کیا بات ہے!ان کو تو براہ راست بھی تبصرہ کر دیتے ہیں ۔دوسرے جو خاص افسانہ دسمبر کے حوالے سے ڈاکٹر بشریٰ تسنیم کا ہے اس کے بارے میں کیا کہوں! وہ کسی بھی ایشو کے حوالے سے جذبات کو مہمیز کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔اللہ ان کے قلم کو تادیر توانا رکھے۔

ادارہ بتول کا لٹریچر عوام الناس تک پہنچانے کے انتظامات کرنے چاہئیں ۔کتب میلے اس کا بہترین ذریعہ ہیں ۔اس ماہ کے اوائل میں کراچی میں منعقدہ عالمی کتب میلے میں جا کر بہت کوفت ہوئی جب ادب کے نام پر پاپولر فکشن کی بھرمار اور اس طرز کے دیگر رائٹرز کے مجموعے نئے گیٹ اپ کے ساتھ مجھے پہلی دفعہ نظر آئے۔معاشرے کو تشکیک زدہ،جنس زدہ اور عیش پسند بنانے کے ایجنڈے کی ایک کڑی! مجھے سخت افسوس ہوا کہ کاش ہمارے اداروں کی مطبوعات کی کم از کم فہرست تو یہاں آنے والے ہر فرد کو مل جاتی۔

اس موضوع کی وجہ سے باقی تبصرہ رہ گیا۔مختصر یہ کہ بتول ہم بہت عزت اور خوشی کے ساتھ عام افراد کے

ہاتھوں میں دیتے ہیں کیونکہ یہ ایک مکمل میگزین ہے۔ دسمبر کے شمارے کی خاص بات جویریہ سعید کی البرٹا سے لکھی کہانی ہے۔ میرا اس سے فیس بک پر رابطہ ہے۔ بتول میں لکھنے کا مشورہ میں نے ہی دیا تھا۔ سوچ میں پختگی اور بیان میں روانی ہے۔

دسمبر کے شمارے کی خاص بات ایک خوشگوار شام کے نام سے حریم ادب لاہور کی نشست کی روداد ہے۔ واقعی خوشگوار احساس پڑھ کر ہوا یہ تقریب ہر مہینے ہوتی ہے تو اس سے بتول کے قارئین کو ضرور مستفید کیا کریں نا!

ہاں! ایک اور بات جو 2013ء میں خوشگوار رہی وہ شاہدہ ناز قاضی صاحبہ کی بتول میں واپسی تھی۔ میں ان کے افسانے اردو ڈائجسٹ میں ڈھونڈ کر پڑھتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے اندر لکھنے کا شوق اپنی تحاریر کے ذریعے پیدا کیا۔ اللہ کرے وہ اپنی تحاریر سے ہمیں نوازتی رہیں۔

☆☆☆

# میری لائبریری سے

مطالب کلام اقبال اردو
ترجمہ وتشریح: مولانا غلام رسول مہرؔ
پبلشرز : شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

کتابوں کے تعارف ''میری لائبریری سے'' کے عنوان سے بتول میں شائع ہو رہے ہیں۔ جن میں کتابوں سے محبت کرنے والوں کے لئے بہت کچھ ہوتا ہے۔ پڑھنے والے وہاں سے کتابوں کا تعارف حاصل کر کے کچھ تسکین حاصل کرتے ہیں۔ پھر من پسند کتابوں کے مطالعہ کے لئے جستجو میں رہتے ہیں۔

اس سلسلے کی افادیت کا خیال کرتے ہوئے جی میں آیا کہ ہم بھی کیوں نہ اس عنوان کے تحت اپنی لائبریری سے کچھ کتابوں کا تعارف بھیجیں جو ہمیں بہت پسند ہیں۔ لہٰذا اس عنوان کے تحت اس کتاب ''مطالب کلام اقبال اردو'' کا تعارف بھیج رہی ہوں۔

اس کتاب کے عنوان سے قارئین یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کوئی لغت کی طرح کی کتاب ہوگی۔ جس میں مطالب بیان کئے گئے ہوں ایک لحاظ سے یہ سوچنا درست بھی ہے۔

یہ کتاب ''کلام اقبال کی شرح'' ہے جس میں ان کی نظموں کے پس منظر تعلیمات کی تشریح اور اشعار کے صحیح مفہوم کو مختصر بیان کیا گیا ہے۔

کلام اقبال کا اصل مفہوم تاریخی پس منظر اور خود علامہ اقبال کی تفریحات بھی اس کے متن میں موجود ہیں۔ شرح کو نہ بہت پھیلایا گیا ہے کہ پڑھنے والے پر بار گزرے اور نہ اتنا مختصر کہ مفہوم تشنہ رہ جائے۔ بقول مولانا غلام رسول مہر صاحب پوری احتیاط رکھی گئی ہے کہ اقبال کے اپنے مفہوم میں نہ اپنی طرف سے کوئی آمیزش ہو اور نہ کسی تصریح کا اضافہ کیا جائے۔

مولانا صاحب نے اقبال کی خدمت میں پورے ہوش مندی کے بارہ چودہ سال گزارے تھے اور ان کی اپنی زندگی کی بہت سی باتیں خود ان کی زبان سے سن چکے تھے۔ کتاب کی اشاعت کے بارے میں کہتے ہیں کہ اقبال نے جس ماحول میں خاص تاثرات و تصورات کے پیش نظر جو کچھ کہا اسے دیانت داری سے اسی رنگ میں پیش کیا جائے۔ بانگ درا میں بعض نظمیں

ایسی بھی ہیں جن کی حقیقت کو سمجھنے میں مختلف اصحاب نے ٹھوکر کھائی اور اقبال کے کلام کو تضاد کا مورد قرار دے کر اپنے اطمینان کیلئے یہ توجیہہ کر لی کہ اقبال ایک خاص وقت میں وطنیت کے معتقد تھے۔ پھر وہ اسلام کے ترجمان بن گئے۔اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ فکر و نظر کے بلوغ کے ساتھ جزئیات کی تشریح میں ہر انسان کا انداز اسلوب اور طریق استدلال بدلتا رہتا ہے لیکن مقاسد اور میادی نہیں بدلتے۔اقبال جیسے ابتدا میں وطن کیلئے احساسات رکھتے تھے ویسے ہی آخری دم تک رہے۔وہ پہلے بھی اپنے وطن کا آزادی اور خدمت گزاری کے سرگرم حامی تھے۔اور آخری دنوں میں بھی بدستور ہو کر یہ جذبہ ان کے سینے میں پرجوش رہا۔ وہ حب الوطنی کے مخالف کبھی نہ ہوئے البتہ وطنیت کے یورپی مفہوم کی مخالفت برابر کرتے رہے اور اسے ملت اسلامیہ کی اساس و تنظیم کے منافی بتاتے رہے۔اقبال کا ایک قطعہ اسی کے بارے میں ہے۔

کل ایک شوریدہ خواب گاہ نبیؐ پہ رو رو کے
کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستان کے مسلم بنائے ملت مٹا
رہے ہیں

یہ زائران حریم مغرب ہزار رہبر بنیں
ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا
آشنا رہے ہیں

کتاب میں شرح ہے کہ کل ایک دیوانہ رسول اکرمؐ کی آخری آرام گاہ پر رو رو کر کہہ رہا تھا کہ مصر اور ہندوستان کے مسلمان اسلامی ملت کی بنیاد ڈھا رہے ہیں۔اس سے اقبال کی مراد یقیناً یہ ہے کہ دونوں جگہ کے مسلمان قومیت کی اسلامی بنیاد چھوڑ کر پوری بنیاد اختیار کر رہے ہیں۔اور انہوں نے قوم کی حقیقی فلاح و بہبود کا طریقہ ترک کر کے حاکموں کی مصلحتوں کے مطابق کام شروع کر دیا ہے۔ذاتی فائدے کے لئے وہ قومی فائدے کو قربان کر رہے ہیں۔

یہ لوگ یورپ کو کعبہ سمجھتے ہیں اور اس کی زیارت اپنے لئے فخر کا باعث جانتے ہیں۔ یہ ہزار ہمارے رہبر بنیں لیکن اے رسولؐ پاک جب انہوں نے آپؐ کی تعلیمات سے خاندہ نیہں اٹھایا آپ کے تجویز فرمائے ہوئے راستے سے شناسائی پیدا نہیں کی تو ہمیں ان سے کیا واسطہ ہے؟

اسی طرح کتاب میں نظم ''خضرراہ'' کے بارے

میں تفصیل سے موقع و محل اور موضوع کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں اقبال پر جتنی رقت خضر راہ پڑھنے کے دوران طاری ہوتی اتنی کسی نظم کے دوران نہ ہوئی۔ بعض اشعار پڑھتے ہوئے خود بھی روئے اور مجمع بھی اشکبار ہوا۔ اس میں اہم مسائل پر حضرت خضر کی زبان سے مسلمانوں کے سامنے صحیح راہ عمل پیش کی۔ نظم کا نام ''خضر راہ'' اسی وجہ سے رکھا کہ یہ مشکلات و مصائب کے نہایت نازک دور میں راہنمائی کا مینار تھی۔

مختلف نظموں کے بارے میں کتاب میں تاریخی حقائق بھی ساتھ ساتھ بیان کئے گئے ہیں نظم ''صقلیہ'' (جزیرہ سسلی) جو مرثیہ سسلی قرار پائی تھی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ پہلی بار 1908ء میں مخزن میں چھپی تھی اور اس کے ساتھ ہی نوٹ بھی لکھا گیا تھا کہ ''جزیرہ'' سسلی روئے زمین کے ان حصوں میں سے ہے جہاں اہل عرب نے اپنی فتوحات کا جھنڈا بلند کیا اور ایسی تہذیب کی روشنی پھیلائی۔ وہ اب انقلاب دوران کے ہاتھوں اس حالت میں ہے کہ تاریخ دانوں کے علاوہ کسی کو اس میں اسلام کی عظمت کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ اقبال رات کے وقت جہاز میں اس جزیرے کے پاس سے گزرے اور اس کی روشنیوں کو دیکھ کر بعض خیالات اور جذبات نے ان کی طبیعت پر ہجوم کیا۔ یہ نالہ و مرثیہ اس جذبات و خیالات کا نتیجہ ہے۔

جزیرہ سسلی سے مخاطب ہوتے ہوئے اقبال کہتے ہیں۔

درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں
رنگ تصویر کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصہ ایام سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے
میں ترا تحفہ سوئے ہندوستان لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤں گا

کتاب کے صفحات کی تعداد بارہ سو ہے۔ بانگ درا، بالِ جبریل ضرب کلیم اور مغان حجاز کی شرح اور مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب اگرچہ ضخیم ہے لیکن

اقبال کے طالب علموں کیلئے نادر نسخہ ہے۔ گھروں میں اس کو موجود ہونا چاہیے۔ مہینے میں اگر اپنا ایک جوڑا کم کر کے اسے اپنی لائبریری کی زنیت بنالیا جائے تو اپنے اور اپنی نسل کے لئے ایک بہترین تربیتی ذریعہ میسر آئے گا۔

☆☆☆

مستقبل

(ذکیہ فرحت۔کراچی)

روپے کی قدر گھٹ گئی آتا ہے کوئی دور
بازار بھرے ہوں گے خریدار نہ ہوں گے
انسانیت اس طرح جو ہوتی رہی پامال
میّت بھی اٹھانے کو مددگار نہ ہوں گے
یوں روندی گئی ہے روشِ گلشنِ ہستی
اب شاخ و شجر کوئی ثمربار نہ ہوں گے
پردیس میں جا بستے رہے گر یونہی بچے
تعمیر وطن کے لئے معمار نہ ہوں گے
بیزار ہو ساقی ہی اگر جام وسبو سے
یہ رونقِ میخانہ، یہ مے خوار نہ ہوں گے

☆☆☆

یہ کیسی عقیدت ہے؟

(شازیہ مسلم۔لاہور)

ابھی چند روز پہلے ہمارے نبی محترم سلطانِ انبیاء رحمت عالمﷺ کا جشن ولادت بھرپور طریقے سے منایا گیا۔ڈھول تاشوں کے ساتھ جلوس نکالے گئے۔نعتیں پڑھنے کا انداز اس قدر جوشیلا اور رنگیلا تھا کہ گمان ہورہا تھا کہ کوئی شادی بیاہ کا فنکشن ہورہا تھا۔

اس کے بجائے یہ بہتر ہے کہ ہم نبی پاکؐ کی سنتوں کو تازہ کریں اور اس دن اُنؐ کی زندگی کے رہنما اصولوں کو اپنے عمل کے لئے چُن کر حصول علم کی کوشش کریں۔ہم لوگوں نے اُنؐ کے یوم پیدائش (جو کہ کچھ لوگوں کے نزدیک ان کا یوم وفات بھی ہے) کو ہندوؤں، سکھوں اور یہود ونصاریٰ کے انداز میں منانا شروع کردیا ہے۔ہمیں چاہیے کہ نبیؐ کی اور ان کے اصحابؓ کی سیرت کو پڑھیں اور وہاں سے ان دنوں کے منانے کے طریقے سیکھیں۔کیونکہ نبیؐ نے فرمایا کہ ''دین میں ایجاد کی گئی ہر نئی بات بدعت ہے، ہر بدعت گمراہی ہے اور گمراہی دوزخ میں لے جانے والی ہے۔''

☆☆☆

میری محبوب والدہ

(فوزیہ عباس۔کراچی)

میری والدہ الگ ہی شخصیت کی حامل تھیں جیسے جنت کی حور جنہیں ایک نظر دیکھ کر ہی میں اپنے سارے غم بھول جایا کرتی کہ ان کو دیکھ کر غم نہیں رہتا تھا۔ان کی ایک مسکراہٹ دیکھ کر دل خوش ہوجاتا۔ ماں جس دن مجھ سے بچھڑیں تو ایسا لگا کہ اب ساری دنیا ہی ختم ہوگئی۔ جیسے زندگی کا مقصد ہی چھن گیا لیکن جب قرآن وسنت کو پڑھا تو دل پر جیسے کسی نے مرہم رکھ دیا کہ ''ماں'' تو اللہ نے لی لیکن ستر ماؤں سے زیادہ چاہنے والا تو موجود ہے۔ پہلے جب وہ ہمارے درمیان تھیں تو لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ہم سے بچھڑنے والی ہیں۔کیا پتہ تھا کہ دنیا کی سب سے عظیم دولت چھننے والی ہے،اب ان کی ایک ایک ادا یاد آتی ہے۔دل جیسے کسی نے بری طرح مَسل دیا ہو۔

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ ہم کتنی ناشکری کرتے ہیں جب وہ موجود تھیں تو ان کی قدر ہی نہ کی جیسے کرنی چاہیے۔اللہ ہمیں معاف فرمائے (آمین)۔

ان کی تربیت کا ایک ایک پہلو یاد آتا ہے۔صبح سویرے نماز کے لئے اٹھانا،اپنے ہر بچے کے لئے فکر مند ہوجانا بلکہ خاندان میں کوئی بھی مشکل میں ہوتو اس کے غم کو اپنا غم سمجھنا۔اگر میں یہ کہوں کہ میری ماں میری دوست تھیں تو غلط نہ ہوگا میں چونکہ گھر میں سب سے چھوٹی بہن تھی تو شاید ان کی زیادہ لاڈلی تھی۔کام سے فراغت کے بعد میں اور امی خوب باتیں کرتے۔ایک دوسرے کو یاد کی ہوئی چھوٹی چھوٹی دعائیں سناتے۔ کبھی امی انڈیا کی باتیں بتاتیں کہ ہم کس طرح کے ماحول میں رہتے تھے۔اکثر وہ اپنے بھائیوں کو یاد کرکے آبدیدہ ہوجاتیں۔کبھی بچوں سے ناراض ہوتیں کہ بس ہم جارہے ہیں اپنے بھائیوں کے پاس۔

میری والدہ ادیب عالم تھیں۔خاص طور پر ابو امی کی جب باتیں ہوتیں یا نوک جھونک ہوتی تو ہم کو بھی محاورے یاد ہوجاتے۔امی ابو دونوں کو 40 احادیث با ترجمہ یاد تھیں جو وہ زبانی پڑھتے رہتے۔

میرے والدین کا آپس میں محبت کا الگ ہی انداز تھا۔کبھی امی ان سے جیب مانگتیں تو ابو مزاقاً کہتے تمہاری اماں کسی سود خور کی طرح کھڑی ہوجاتی ہے۔ کبھی ان کی نوک جھونک یاد آتی ہے میری شوگر زیادہ ہے یا تمہاری۔

میری والدہ کی شادی کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔میرے والد اور داداجان جب میرے تایا کی

شادی کے سلسلے میں انڈیا گئے تو میری نانی جان نے کہا کہ بھئی میں اپنی بیٹی کو اکیلی پاکستان نہیں بھیجوں گی۔ یوں میرے ابو کی بھی شادی دوسری بہن یعنی میری والدہ سے ہوگئی۔ بقول میرے والد مجھے پھنسا دیا تمہاری نانی نے۔ میری والدہ کی تربیت میرے بڑے ماموں صاحب نے کی۔انہوں نے تفہیم القرآن جیسے ہی مارکیٹ میں آئی فوراً خرید کر خط لکھا۔مولانا مودودیؒ کو خط لکھا۔بقول میری والدہ کہ ماموں کا بڑا سا دارالمطالعہ تھا جس میں دوسری کتب کے ساتھ نسیم حجازی کے ناول بھی تھے جوان کو بہت پسند تھے۔

میری والدہ کی شادی چودہ برس کی عمر میں ہوئی ہم لوگ ماشاءاللہ آٹھ بہن بھائی ہیں جبکہ میری والدہ نے بچوں کی جدائی بھی سہی اور اس کو بڑے صبر سے برداشت بھی کیا۔میرا ایک بھائی حادثے میں جھلس گیا اور جانبر نہ ہوسکا۔میری ایک اور بہن جب نہم کلاس میں تھیں تو ان کو کینسر ہوگیا جبکہ ان دنوں میرے والد روزگار کے سلسلے میں باہر تھے۔ وہ دور میری والدہ کی زندگی کا کڑا دور تھا۔میری والدہ کی زندگی میں میری دادی جان اور دادا ابو کا بڑا کردار رہا۔میری دادی نے والدہ کو انگریزی پڑھوائی کہ میرے والد کے خطوط پڑھ سکیں اور ایڈریس وغیرہ سمجھ سکیں۔جبکہ میری امی کے الفاظ میں ”تمہارے دادا جان نے ہمیں خوب گھمایا ،اتنا تو تمہارے ابو نے نہیں گھمایا۔“

نماز کی پابندی میرے والدین نے ہم سب بہن بھائیوں کی گھٹی میں ڈالی تھی۔جب مجھ پر درس قرآن کی ذمہ داری ڈالی گئی تو میری والدہ ہمیشہ میرے ساتھ جاتیں۔ یہاں تک کہ مظاہروں تک میں ساتھ جاتیں۔ ان کے الفاظ میں قاضی صاحب (امیر جماعت اسلامی) نے ہم سے سڑک پر سجدے کروادیئے۔انشاءاللہ اگلی دنیا میں یہ ہمارے حق میں بہتر ثابت ہوں گے۔

کچھ سالوں سے میری والدہ اور گھرانے کو شاید کسی کی نظر لگ گئی۔ان کے ایک ڈیڑھ سال کے اندر دو بائی پاس ہوئے۔اس تکلیف کے عالم میں بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ ہمیشہ ذکرِ الٰہی سے زبان تر رہتی اور وہ باوضو رہتیں۔انتقال کے چند دن پہلے ہی تو رشتہ داروں سے ملنے گئی اور ابو کے ساتھ روزانہ واک کرنے جاتیں۔ہم سب بہت خوش تھے کہ اب امی کی طبیعت بحال ہوگئی ہے۔ مسکراتی رہتیں لیکن شاید میرے رب کو والدہ کو اپنے پاس بلانا مقصود تھا کہ آخر

میں پھر درد کی وجہ سے ہسپتال میں ایڈمٹ ہوئیں اورکلمہ طیبہ کا ورد کرتے کرتے اپنے رب کے حضور حاضر ہوگئیں۔ ان کو یہ حدیث قدسی بڑی پسند تھی جومیرے خیال میں ان کی وصیت ہے''جس میں نو باتوں کا حکم ہے۔ جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں۔ جومحروم کرے میں اسے دوں۔ میرے خاموشی تفکّر کی خاموشی ہو۔ میری گفتگو ذکرالٰہی کی گفتگو ہو۔ میری نگاہ عبرت کی نگاہ ہو۔

آخر میں یہ ضرور بتانا چاہوں گی کہ وہ میرے بیٹے ہارون سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد جب انکی چیزیں نکالی جارہی تھیں تو ان کے دراز سے ایک ملفوف تصویر ملی جو ہارون کی تھی۔

☆☆☆

## کفارہ

(ام حبیب۔کراچی)

''گاڑی تیز کرو سگنل بند ہونے والا ہے۔''

اورڈرائیو نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ عین اسی وقت سنگل کی سرخ بتی جلی اور گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اس چوراہے پر کئی طرح کے سوالی موجود تھے۔کوئی کھلونے لیے،کوئی چھوٹی چھوٹی کتابیں لیے،کوئی عورت بچہ کو گود میں لیے،کوئی بوڑھا لنگڑاتا ہوا اوراکثر خواجہ سرا کوئی ریما اور کوئی ریکھا کا روپ دھارے اسے بڑی کوفت ہوتی جب کوئی سوال کررہا ہواور وہ اسے کچھ نہ دے۔مگر جب سے اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ سارے پیشہ ورلوگ ہیں اس وقت سے اس نے یہ اصول بنالیا تھا کہ راستے میں کسی کو کچھ نہیں دینا۔

مگر آج ایسا ہوا کہ سنگل پر گاڑی کے رکنے پر ایک دس سال کا بچہ دوڑتا ہوا آیا اورشیشے پاس کھڑا ہوکر کچھ کہنے لگا۔ وریشہ نے عادت کے مطابق اسے نظرانداز کرتے ہوئے نگاہیں سامنے کی طرف ٹکا دیں۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ بچہ مسلسل سوال کیے جارہا ہے۔ وریشہ نے ایک نظر اس پر ڈالی ۔ وہ ایک فاقہ زدہ مجبور لگا۔اس کا دل چاہا کہ پرس میں سے کچھ نکال کردے دے۔ عین اسی وقت سنگل کھل گیا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

گھر آنے کے بعد بھی وہ بچہ یاد آرہا تھا کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ واقعی میری مدد کا مستحق تھا اوراسے واقعی بھوک لگی ہو۔کاش! میں نے اسے کچھ دے دیا ہوتا۔ پھراس نے ایک فیصلہ کیا کہ کسی نہ کسی غریب کے گھر ہر

مہینے راشن ڈالوئے گی تا کہ جن لوگوں کے حقوق ہم پر ہیں ان کا کچھ کفارہ ادا ہو سکے کیونکہ ''صدقہ مال کو کم نہیں کرتا۔'' (حدیث)

☆☆☆